مالوے کی لوک کہانیاں
صادق
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، دہلی

مالوے کی لوک کہانیاں

صادق

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی

وزارت ترقی انسانی وسائل، حکومت ہند

فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی۔110025

پہلی اشاعت	:	1985
دوسری طباعت	:	2011
تعداد	:	1100
قیمت	:	-/12 روپے
سلسلۂ مطبوعات	:	263

Malve Ki Lok Kahaniyan
Edited by
Sadique

ISBN :978-81-7587-728-3

ناشر: ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، فروغ اردو بھون، FC-33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا، جسولہ، نئی دہلی 110025، فون نمبر: 49539000، فیکس: 49539099
شعبۂ فروخت: ویسٹ بلاک-8، آر۔ کے۔ پورم، نئی دہلی-110066
فون نمبر: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: urducouncil@gmail.com، ویب سائٹ: www.urducouncil.nic.in
طابع: جے۔ کے۔ آفسیٹ پرنٹرز، بازار ضیا محل، جامع مسجد، دہلی-110006
اس کتاب کی چھپائی میں 70GSM, TNPL Maplitho(Top) کا غذ استعمال کیا گیا ہے۔

پیش لفظ

پیارے بچو! علم حاصل کرنا وہ عمل ہے جس سے اچھے برے کی تمیز آجاتی ہے۔ اس سے کردار بنتا ہے، شعور بیدار ہوتا ہے، ذہن کو وسعت ملتی ہے اور سوچ میں نکھار آجاتا ہے۔ یہ سب وہ چیزیں ہیں جو زندگی میں کامیابیوں اور کامرانیوں کی ضامن ہیں۔

بچو! ہماری کتابوں کا مقصد تمھارے دل و دماغ کو روشن کرنا اور ان چھوٹی چھوٹی کتابوں سے تم تک نئے علوم کی روشنی پہنچانا ہے، نئی نئی سائنسی ایجادات، دنیا کی بزرگ شخصیات کا تعارف کرانا ہے۔ اس کے علاوہ وہ کچھ اچھی اچھی کہانیاں تم تک پہنچانا ہے جو دلچسپ بھی ہوں اور جن سے تم زندگی کی بصیرت بھی حاصل کرسکو۔

علم کی یہ روشنی تمھارے دلوں تک صرف تمھاری اپنی زبان میں یعنی تمھاری مادری زبان میں سب سے موثر ڈھنگ سے پہنچ سکتی ہے اس لیے یاد رکھو کہ اگر اپنی مادری زبان اردو کو زندہ رکھنا ہے تو زیادہ سے زیادہ اردو کتابیں خود بھی پڑھو اور اپنے دوستوں کو بھی پڑھواؤ۔ اس طرح اردو زبان کو سنوارنے اور نکھارنے میں تم ہمارا ہاتھ بٹا سکو گے۔

قومی اردو کونسل نے یہ بیڑا اٹھایا ہے کہ اپنے پیارے بچوں کے علم میں اضافہ کرنے کے لیے نئی نئی اور دیدہ زیب کتابیں شائع کرتی رہے جن کو پڑھ کر ہمارے پیارے بچوں کا مستقبل تابناک بنے اور وہ بزرگوں کی ذہنی کاوشوں سے بھرپور استفادہ کرسکیں۔ ادب کسی بھی زبان کا ہو، اس کا مطالعہ زندگی کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد دیتا ہے۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ بھٹ
ڈائرکٹر

فہرست

دیباچہ

مدھیہ پردیش میں وِندھیاچل کے پہاڑی سلسلے سے گھرا ہوا ایک خوبصورت اور زرخیز علاقہ ہے، جو "مالوہ" کہلاتا ہے۔ اس کے اُتر میں چمبل ندی کی گھاٹی ہے۔ دکن میں نربدا ہے اور پورب میں بیتوا بہتی ہے۔ ان کے علاوہ بھی کئی ندیاں ہیں جو مالوہ کی سرزمین کو شاداب اور زرخیز بناتی اور اس کے قدرتی حُسن کو دوبالا کرتی ہیں۔

مالوہ کی بولی "مالوی" کہلاتی ہے جسے کارچیڑجی اور گریرسن نے اپنے ہندوستانی زبانوں کے جائزے میں مالوی کا خاص طور پر ذکر کیا ہے۔ اس بولی میں بڑی مٹھاس اور رس ہے۔ یہ بولی پہلے پورے مالوے میں بولی جاتی تھی لیکن رفتہ رفتہ شہروں میں اس کا استعمال کم ہونے لگا ہے۔ دیہاتوں میں مالوی اب بھی پہلے ہی کی طرح رائج ہے لیکن شہری اور دیہاتی مالوی میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ مالوی کا اپنا کوئی رسم خط نہیں ہے۔ اس کا زیادہ تر ادب عوامی گیتوں، کہانیوں اور ڈراموں (ماچ) کی شکل میں برسہا برس سے تخلیق ہو رہا ہے۔ اس طرح مالوی میں عوامی ادب کی روایت خاصی پُرانی اور مضبوط ہے۔ مالوی کا عوامی ادب "گیت" اور "اگیت" ناموں سے پکارا جاتا ہے۔

پندرہ سولہ برس پہلے کی بات ہے۔ محترم عتیق حنفی صاحب نے توجہ دلائی کہ اردو میں مالوے کی لوک کہانیوں پر کام نہیں ہوا ہے۔ اگر میں یہاں کے مختلف علاقوں میں گھوم پھر کر مالوے کی لوک کہانیاں جمع کر دوں تو یہ ایک اچھا کام ہوگا۔ میں اُن دِنوں بی۔ اے کا طالب علم تھا۔ کام کرنے کا شوق، جوش اور وقت سبھی چیزیں پاس تھیں۔ لہٰذا اِس کام میں جُٹ گیا اور ایک قلیل سی مُدت میں ڈیڑھ سو سے زائد کہانیاں جمع کر لیں۔ لیکن مجھے مالوی بولی سے بہت زیادہ واقفیت نہ تھی۔ اس لیے میرے کام کا دائرہ بھی محدود رہا۔ یعنی میں نے لوک کہانیاں حاصل کرنے کے سلسلے میں صرف اُنہی گھرانوں تک رسائی حاصل کی جو اردو آمیز مالوی یا مالوی آمیز اردو بولتے تھے۔ کہانیاں جمع کر لینے کے بعد جائزہ لینے پر پتہ چلا کہ ان میں سے بہت سی کہانیاں دراصل لوک کہانیاں نہیں ہیں اور ان میں سے زیادہ تر بچّوں کے

رسالوں اور کتابوں میں شایع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ ایسی کہانیاں بھی شامل ہیں جن کا تعلق ہندوستانی دیومالا سے ہے۔ اس لیے وہ لوک کہانیوں کی حیثیت سے رائج ہونے کے باوجود اس زمرے میں شامل نہیں کی جا سکتیں۔ پھر ایسی کہانیاں بھی ہیں جو ہندوستان کے مختلف صوبوں کی لوک کہانیوں کی حیثیت سے شایع ہو چکی ہیں۔

ان سب باتوں کو دھیان میں رکھ کر میں نے اپنی جمع کی ہوئی کہانیوں میں سے ایک سخت انتخاب تیار کیا۔ اس میں صرف وہی کہانیاں شامل کیں جنھیں مقامی خصوصیات کی بنا پر مالوے کی کہانیاں قرار دینے میں کوئی تامل نہیں ہو سکتا تھا۔

زیرِ نظر کتاب انھی میں سے چند کہانیوں پر مشتمل ہے۔ اگر یہ کتاب پسند کی گئی تو باقی کہانیاں دوسرے حصے میں پیش کرنے کی سعی کروں گا۔ اس کتاب کی اندرونی تصاویر جناب رحیم گنی نے تیار کی ہیں جو مالوہ قلم کے نمائندہ مصور ہیں۔ تصویروں کی تیاری میں انھوں نے اپنا جو قیمتی وقت صرف کیا ہے۔ اس کے لیے میں ان کا ممنون ہوں۔

صادق
استاد: شعبۂ اردو
دہلی یونیورسٹی، دہلی

بادام کے چھلکے

کسی شہر میں ایک بڑھیا رہتی تھی ۔ اس کا شوہر بہت زمین جائیداد چھوڑ کر مرا تھا اور بیٹا بھی تجارت میں خوب کماتا تھا اس لیے گھر میں کافی دولت تھی ۔ اُن کے گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی ۔ لیکن وہ بڑھیا تھی بڑی کنجوس ۔ وہ بڑھیا بہت بدزبان بھی تھی ۔ ہر ایک کو بُرا بھلا کہتی ۔ اسے لوگوں کا دل دُکھانے میں بڑا مزا آتا تھا ۔

بڑھیا کا بیٹا بہت سمجھ دار ، نیک اور خدا ترس تھا ۔ وہ غریبوں ، بےکسوں اور ضرورت مندوں کی مدد کرتا تھا ۔ وہ اپنی ماں کو بہت سمجھاتا کہ " ماں تجھے کس چیز کی کمی ہے ؟ گھر میں خُدا کا دیا سب کچھ موجود ہے پھر تو اتنی کنجوسی کیوں کرتی ہے ؟ روپیہ پیسہ تو خرچ کرنے کی چیز ہوتی ہے ۔ مال و دولت چاندی سونا جمع کر کے کوئی اپنے ساتھ نہیں لے جاتا لیکن نیکی اور اچھے کام آدمی کے ساتھ جاتے ہیں ۔ خُدا کی راہ میں خرچ کی ہوئی دولت ہی انسان کے کام آتی ہے ۔ اس لیے اب تمھیں دھن دولت جمع کرنے کی فکر چھوڑ دینی چاہیے ۔ اب تم خوب خرچ کرو ، خوب آرام سے رہو اور اپنی زبان سے لوگوں کے دل نہ دُکھاؤ

کیونکہ کسی کا دل دُکھانا بُری بات ہے۔"

بُڑھیا کو بیٹے کی یہ باتیں بُری لگتی تھیں، اس کا خیال تھا کہ اس کا بیٹا بہت بے وقوف اور فضول خرچ ہے۔ اسی لیے تو ایسی باتیں کرتا ہے ورنہ میں کنجوسی کب کرتی ہوں، میں تو کفایت شعاری سے کام لیتی ہوں۔ ہاں اس کی طرح بھوکے ننگے لوگوں میں اپنا روپیہ نہیں لُٹاتی پھرتی اور میں بدزبان بھی کب ہوں؟ ہمیشہ سچ بات ہی تو کہتی ہوں۔ اب اگر سچ بات کہنے سے کسی کا دل دُکھتا ہے تو دُکھا کرے، سچ تو کڑوا ہی ہوتا ہے۔

آخر بیٹے نے تنگ آکر اُسے کچھ سمجھانا بجھانا چھوڑ دیا۔ اس نے سوچا کہ ماں اپنی عادتیں چھوڑنے والی نہیں ہے اس لیے اُسے اُس کے حال پر چھوڑ دینا ہی بہتر ہے۔ وہ جو چاہے سو کرے لیکن پھر بھی اسے اس بات کی بڑی فکر رہتی تھی کہ ماں غریبوں اور ناداروں کی مدد نہیں کرتی، مرنے کے بعد اس کی بخشش کیسے ہوگی؟

ایک بار اُسے پتہ چلا کہ شہر میں ایک بزرگ آئے ہوئے ہیں۔ وہ بڑے نیک اور اللہ والے ہیں، وہ رات رات بھر تو عبادت کرتے ہیں اور دن کو لوگوں کے دُکھ درد سُنتے اور انہیں دُور کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اُنہوں نے شہر کے باہر دریا کے کنارے اپنا ڈیرہ جما رکھا ہے۔ ان کے پاس لوگ جوق در جوق جاتے ہیں اور ان کا دیدار کرتے ہیں۔ انہیں اپنے دُکھ درد سُناتے ہیں اور اپنے دُکھوں سے چھٹکارا پاتے ہیں۔

بُڑھیا کے بیٹے نے سوچا، کیوں نہ میں بھی ان کے حضور میں حاضر

دُوں۔ انہیں اپنی ماں کے بارے میں سچ سچ بتاؤں۔ اُن سے اپنی ماں کی بخشش کے بارے میں بات کروں۔ شاید اُن کی مدد سے ماں کی بخشش کا کوئی راستہ نکل آئے۔ یہ سوچ کر وہ اُن بزرگ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اُنہیں اپنے دل کی بات بتائی۔ بزرگ نے فرمایا :۔" آدمی کی زندگی اس کے اپنے لیے نہیں ہوتی، وہ تو دوسروں کے لیے جیتا ہے، دُوسروں کے لیے مرتا ہے، سب سے ہمدردی اور محبّت سے پیش آتا ہے اور ان کے دُکھ درد دُور کرتا ہے۔ لیکن جو آدمی ایسا نہ کرے، اپنے حصّے میں سے دوسروں کو حصّہ نہ دے بلکہ ان سے بُری طرح پیش آئے، اُنہیں بُرا بھلا کہے، ایسے انسان کی بخشش کیسے ہوسکتی ہے؟ خیر جب تُو نیک ارادہ لے کر یہاں آیا ہے تو ہم کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح اُسے کنجوسی اور بدزبانی جیسی بُرائیوں سے چھٹکارا مل جائے۔ اگر وہ نیک راستے پر آجائے گی تو اللہ اس کے گناہوں کو بخش دے گا۔"

بُڑھیا کے بیٹے کے دل پر بزرگ کی ان باتوں کا بہت اثر ہوا۔ اسے کچھ اطمینان بھی ہوا اور وہ بزرگ کا شکریہ ادا کرکے اپنے گھر لوٹ آیا۔

اگلے دن وہی بزرگ ایک بوڑھے فقیر کا بھیس بدل کر اس بڑھیا کے گھر گئے اور انہوں نے اپنا چمٹا بجا کر زور سے صدا لگائی۔ جب بُڑھیا دروازے پر آئی تو فقیر نے اپنا کاسہ اس کے سامنے کردیا اور بولا "نیک مائی، نیک مائی، دے خدا کے نام پر۔" بڑھیا بولی ـــــ "کلموہے خدا تجھے غارت کرے، خود بوڑھا کھوسٹ ہو رہا ہے، قبر میں پیر لٹکائے بیٹھا ہے اور مجھے 'مائی' کہتا ہے، تجھے شرم نہیں آتی؟"

فقیر نے مسکرا کر کہا :۔" اللہ تیری عمر میں برکت دے، مجھ سے غلطی
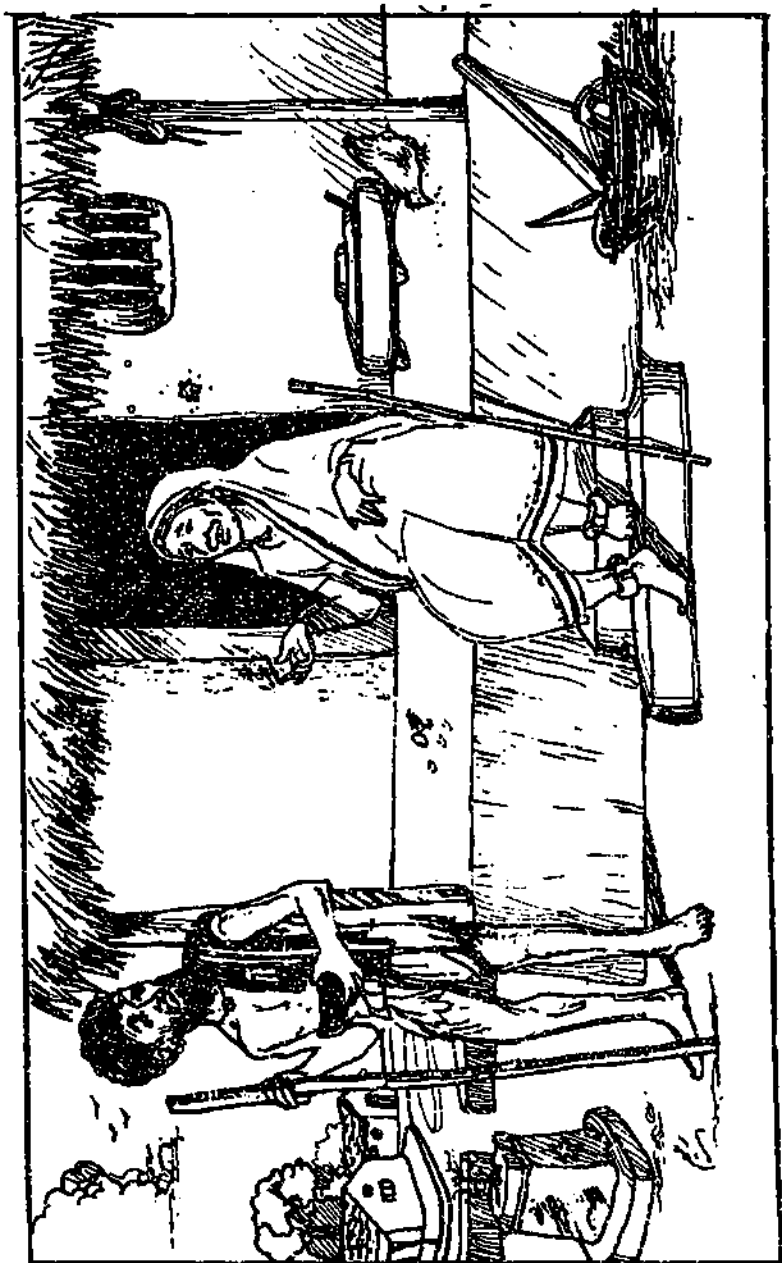
ہوئی جو تجھ کو 'مائی' کہہ دیا۔ واقعی تو عمر میں مجھ سے چھوٹی ہے۔ اب مجھے معاف کر، اور اپنا دل صاف کر۔ اے بیٹی، خدا کے نام پر مجھے کچھ مل جائے۔"

بڑھیا غصّے سے بولی :۔" مُونڈی کاٹے، خبیث، میں تیری بیٹی کاہے کو ہونے لگی؟ بھک منگا ہوکر مجھے بیٹی کہتا ہے۔ تیری یہ ہمت!"

فقیر نے کہا :۔" تجھ پر اللہ کا کرم، واقعی مجھ سے پھر غلطی ہوگئی کہ بھک منگا ہوکر تجھے بیٹی کہہ دیا۔ تُو تو امیر زادی ہے۔ اچھا، اب مجھے معاف کر، کدُورت سے اپنا دل صاف کر، اے جنّتی عورت خدا کے نام پر مجھے کچھ خیرات دے۔"

بُڑھیا پھر بھپر گئی، پیر پٹخ کر بولی :۔" خیرات خورے، صُورت حرام تیرے منہ میں خاک، مجھے 'جنّتی عورت' کہتا ہے۔ کیا میں مرگئی ہوں؟"

فقیر نے گھبرا کر کہا ـــ" نہیں نہیں، خدا نہ کرے، میرا مطلب یہ نہ تھا مجھے پھر معاف کر، خدا تیرا بھلا کرے، تیری عمر دراز کرے، اللہ تجھے دُنیا کی تمام نعمتیں اور مال و زر عنایت کرے۔ اے نیک بی بی، میں دو دن سے بھوکا ہوں۔ اللہ کے نام پر مجھے ایک روٹی اور چمچہ بھر سالن مل جائے۔"

اس بار فقیر نے جو دعائیں دیں ان کا بُڑھیا کے دل پر یہ اثر ہوا کہ اس نے فقیر کو گالیاں نہیں دیں، بس ناگوار لہجے میں اتنا ہی کہا ـــ "بے وقوف بڈھے، کیا مجھے ہوٹل بھٹیاری سمجھ رکھا ہے جو روٹی سالن مانگ رہا ہے؟ چل اپنا راستہ لے۔"

فقیر نے گڑگڑاتے ہوئے کہا :۔" اے نیک بی بی، روٹی سالن نہ سہی

ایک مٹھی آٹا ہی دے دے۔"

بُڑھیا تنک کر بولی :"کیا تیرے باپ نے آٹا لا کر رکھ دیا ہے، جو ایک مٹھی تجھے دے دوں، چل نکل یہاں سے۔"

فقیر بولا :" اے نیک بی بی، اچھا مٹھی بھر آٹا نہ سہی، چٹکی بھر ہی دے دے۔"

بڑھیا بولی :" دیکھ اب زیادہ تنگ نہ کر۔ تجھے شہر بھر میں ایک میرا ہی گھر ملا ہے جو منہ اٹھائے روز چلا آتا ہے۔ آج تو میں تجھے مونگ کا ایک دانہ تک نہ دوں گی۔ اچھا اب نکل یہاں سے۔"

فقیر نے سوچا یہ بڑھیا تو کچھ دینے والی نہیں لیکن وہ اس سے کچھ لیے بغیر جانا نہیں چاہتا تھا۔ یکایک اس کی نظر بادام کے چھلکوں پر پڑی کسی نے بادام کھا کر اس کے چھلکے آنگن میں پھینک دیئے تھے۔ فقیر بولا: اُے نیک بی بی! میں تیری سخاوت سے مایوس نہیں ہوں۔ آج تو تجھ سے کچھ لے کر ہی جاؤں گا۔ اچھا چٹکی بھر آٹا نہ سہی، یہ بادام کے چھلکے ہی دے دے۔"

بڑھیا نے کہا :" تُو کیسا بے غیرت فقیر ہے۔ جونک کی طرح چمٹ گیا ہے۔ کسی طرح پیچھا نہیں چھوڑتا۔ ارے بادام کے ان چھلکوں کو پیس کر تو میں منجن بناؤں گی، بھلا تجھے کیوں دے دوں؟"

فقیر بولا :" سوچ لے، مَیں تو تیرے ہی فائدے کے لیے کہہ رہا ہوں۔"

اپنے فائدے کو سُن کر بڑھیا کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ خوش ہو کر بولی :" میرے فائدے کے لیے! وہ کیسے؟"

فقیر بولا :" وہ اس طرح کہ مَیں بادام کے ان چھلکوں کے بدلے

تجھے ایک اشرفی دوں گا۔"

"اِن چھلکوں کے بدلے ایک اشرفی دے گا!! کہاں ہے اشرفی ؟ لا مجھے دے!" خوشی کے مارے بڑھیا کی باچھیں کِھل گئیں۔

فقیر نے کہا :۔" ابھی نہیں، کل لاکر دوں گا۔"

بڑھیا ہاتھ نچا کر بولی :۔" کل کہاں سے لائے گا ؟ کیا رات کو کہیں چوری کرے گا ؟ "

فقیر بولا :۔" توبہ توبہ میں چوری کیوں کرنے لگا۔"

بڑھیا نے پوچھا :۔" تو پھر کہاں سے لائے گا اشرفی ؟ "

فقیر نے اِدھر اُدھر دیکھا کہ کہیں اُسے کوئی دیکھ تو نہیں رہا ہے۔ پھر آہستہ سے بولا :۔" بات یہ ہے کہ میں ہر رات قبرستان جاتا ہوں۔ وہاں رات بھر کسی قبر میں لیٹ رہتا ہوں اور صبح قبر کی خبر لے آتا ہوں۔ اس کام کے لیے اللہ میاں مجھے پانچ اشرفیاں دیتے ہیں۔ آج رات قبر کی خبر لانے کے بدلے کل صبح مجھے جو پانچ اشرفیاں ملیں گی تو میں ان میں سے ایک تجھے دے دوں گا۔ لا یہ بادام کے چھلکے مجھے دے دے۔"

بڑھیا نے بے تابی سے پوچھا :۔" اچھا، اگر میں قبر کی خبر لاؤں تو کیا اللہ میاں مجھے بھی پانچ اشرفیاں دیں گے ؟ "

"کیوں نہیں، ضرور دیں گے۔" فقیر نے کہا :۔" لیکن یہ بادام کے چھلکے مجھے دے دے۔"

بڑھیا نے بادام کے چھلکے اُٹھا کر فقیر کو دے دیے اور بولی :۔" لو بابا یہ سارے چھلکے تم لے لو۔ مجھ سے تو کسی کی ضرورت نہیں دیکھی جاتی۔ خُدا نے مجھے بہت بڑا دل دیا ہے۔"

فقیر نے اسے یاد دلایا :" لیکن تم اِن چھلکوں کا منجن بنانا چاہتی تھیں۔"

"منجن بنا کر مَیں کیا کروں گی ؟ میرے مُنہ میں دانت تو ہیں نہیں!" بُڑھیا نے اپنے پوپلے مُنہ سے ہنستے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے" فقیر نے اس سے بادام کے چھلکے لیتے ہوئے کہا :" میں کل صبح آکر تمہیں ایک اشرفی دے دوں گا۔"

بُڑھیا بولی :- " نہیں نہیں، اشرفی دینے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ بھلا اللہ کے نام پر کوئی چیز دی جائے تو اس کی قیمت لی جاتی ہے ؟ بس تم تو اِتنا کرنا کہ آج قبرستان مت جانا۔ اللہ میاں سے کہہ دینا کہ تمہارے بدلے میں قبر کی خبر لے آیا کروں گی ۔"

فقیر نے اس کی بات مان لی اور اسے دعائیں دیتا ہوا چلا گیا۔

بُڑھیا کے دِل ہی دِل میں لڈو پھوٹ رہے تھے ۔ کہتے ہیں کنجوس انسان لالچی بھی ہوتا ہے۔ اس بُڑھیا کے دل میں بھی لالچ نے گھر کر لیا۔ وہ سوچنے لگی کہ فقیر کے بدلے ہر روز رات کو وہ خود کسی قبر میں جاکر لیٹ جایا کرے گی اور دوسری صبح اللہ میاں کو قبر کی خبر سُناکر پانچ اشرفیاں انعام پایا کرے گی۔

جب رات ہوئی تو بُڑھیا دوڑی دوڑی قبرستان پہنچی اور ایک ٹوٹی پھوٹی قبر میں جاکر لیٹ گئی۔ وہ انتظار کرنے لگی کہ قبر میں فرشتے آئیں گے اور اسے خبر سُنائیں گے ۔ اسے اسی طرح لیٹے لیٹے بہت رات ہوگئی، لیکن کوئی نہیں آیا۔ تھوڑی دیر بعد جنگلی جانوروں کے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ اب تو بڑھیا کو ڈر لگنے لگا۔ لیکن پانچ اشرفیاں پانے کے لالچ میں وہ قبر ہی میں لیٹی رہی۔

اسی طرح آدھی رات ہوگئی۔ بُڑھیا کو نیند آنے لگی۔ اس نے اپنے

دل میں سوچا کہ اگر میں سو گئی تو پھر اللہ میاں کو قبر کی خبر نہ دے سکوں گی اور مجھے اشرفیاں بھی نہیں ملیں گی۔ اس لیے کسی طرح نیند کو بھگانے کی کوشش کرنا چاہیے۔ بس پھر کیا تھا، وہ نیند کو بھگانے کی کوشش میں لگ گئی، وقت گزرتا گیا، گزرتا گیا۔

رات کے آخری پہر میں یکایک زور کی آواز ہوئی، جیسے بجلی کڑکی ہو۔ بڑھیا نے دیکھا کہ قبر کا ایک حصّہ روشن ہوگیا ہے۔ اس روشنی میں اچانک ایک آدمی نمودار ہوا، پنکھا ایسے بڑے بڑے کان، لال لال دہکتی ہوئی آنکھیں، چپٹی سی ناک اور یہ بڑا منہ جس میں بڑے بڑے نوک دار دانت چمک رہے تھے، ایسا بھیانک آدمی کہ دیکھتے ہی ڈر لگتا تھا۔

وہ آدمی اس کی طرف بڑھتے ہوئے گرج دار آواز میں بولا ــــ "کم بخت بڑھیا، آفت کی پڑیا! تو نے کنجوسی اور لالچ کے پھیر میں پڑ کر کبھی کسی کے ساتھ نیکی یا بھلائی نہیں کی۔ کبھی کسی کی مدد نہیں کی۔ بلکہ تو اپنی زبان سے بھی لوگوں کے دِل دُکھاتی ہے۔ اس کے بدلے اب تجھے ہمیشہ قبر کا عذاب سہنا پڑے گا؟"

یہ کہہ کر اس نے اپنے کندھے سے ایک جھولی اُتاری اور اسے اُلٹ کر جھٹک دیا۔ جھولی میں سے کئی سانپ اور بچھّو نیچے گرے اور رینگتے ہوئے بُڑھیا کی طرف بڑھنے لگے۔

اب تو بُڑھیا بہت گھبرائی۔ اس نے ڈر کر ایک چیخ ماری، اس پر اُس بھیانک آدمی نے ایک زور دار قہقہہ لگایا اور بولا :- "جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ اگر تو نے کسی کے ساتھ بھلائی کی ہوتی تو وہ نیکی تیرے کام آتی۔" یہ کہہ کر وہ غائب ہوگیا۔

اس کے چھوڑے ہوئے سانپ بچھو اب بڑھیا کے بہت قریب آچکے تھے۔ بڑھیا ڈر کے مارے تھر تھر کانپنے اور رونے چلّانے لگی:۔ "بچاؤ، بچاؤ خدا کے لیے کوئی مجھے بچاؤ۔"

قبر کے روشن حصّے میں یکایک ایک اور شخص سامنے آیا، اتنا خوب صورت کہ بس دیکھے جاؤ۔ اس کے نورانی چہرے پر سفید داڑھی تھی، نورانی چہرے والے نے بے حد میٹھی آواز میں بڑھیا سے کہا ــــ بڑی بی، ڈرو نہیں! یہ سانپ اور بچھو تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ــــ اپنی زندگی میں تم نے صرف ایک ہی نیکی کی ہے، آج وہی تمہارے کام آئے گی۔"

یہ کہہ کر اس نے اپنے کندھے پر لٹکی ہوئی جھولی میں ہاتھ ڈالا اور اس میں سے کوئی چیز نکال کر بڑھیا کی طرف پھینکی اور خود غائب ہوگیا۔

بڑھیا نے دیکھا، یہ تو وہی بادام کے چھلکے تھے جو اُس نے اپنے دروازے پر آئے ہوئے فقیر کو دیئے تھے۔

سانپ بچھو اپنے پھن اور ڈنک اٹھائے ہوئے بڑھیا کے بالکل پاس آگئے۔ بڑھیا ڈر کے مارے پھر کانپنے لگی اور رونے چلّانے لگی۔

سانپ بچھوؤں نے جیسے بڑھیا کو کاٹنا اور ڈنک مارنا چاہا، وہ بادام کے چھلکے اُڑ کر ان کے منہ پر آگئے اور انہوں نے بڑھیا کو بچا لیا۔

رات بھر یہی ہوتا رہا۔ سانپ اور بچھو بڑھیا کو ڈسنے کے لیے آتے اور بادام کے چھلکے بیچ میں آکر ان کے منہ پر لگ جاتے اور بڑھیا کو بچا لیتے اسی طرح صبح ہوگئی۔

بڑھیا کا بیٹا اپنی ماں کو ڈھونڈتا ہوا جب قبرستان میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ اس کی ماں ایک ٹوٹی پھوٹی قبر میں پڑی ہوئی ہے۔ اس کی

آنکھیں لال لال ہو گئی ہیں۔ چہرہ پیلا پڑ گیا ہے اور بہت کمزور نظر آرہی ہے جیسے برسوں کی بیمار ہو۔

بیٹا اپنی ماں کو اس حال میں دیکھ کر رونے لگا۔ اس نے ماں کو قبر سے نکالا اور اپنے گھر لے آیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد بڑھیا بالکل اچھی ہو گئی۔

اب تو اس کی زندگی ہی بدل گئی۔ اس نے اپنی کنجوسی کی عادت ہی چھوڑ دی اور پہلے جیسی لالچی بھی نہ رہی۔ کوئی بھی ضرورت مند یا فقیر اس کے پاس آتا تھا، کبھی خالی ہاتھ واپس نہ جاتا، اب وہ پہلے جیسی بدزبان بھی نہ تھی اور جب تک زندہ رہی، سب کے ساتھ محبّت اور نرمی سے پیش آتی رہی۔
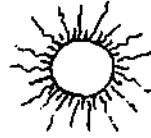
ننڈو کی شاعری

بہت پرانی بات ہے کسی گاؤں میں ایک برہمن رہا کرتا تھا۔ یہ برہمن زیادہ پڑھا لکھا تو نہ تھا لیکن گاؤں والے بیچارے جاہل ٹھہرے۔ وہ سب اسے بہت پڑھا لکھا سمجھتے۔ اس کا بڑا ادب کرتے اور اسے پنڈت جی کہتے تھے۔

پنڈت جی کو نہ تو کھیتی آتی تھی اور نہ وہ کوئی اور کام ہی جانتے تھے۔ بس دھرم کرم کی دو چار باتیں جانتے تھے اور گاؤں والوں کو وہی باتیں بتاتے رہتے تھے۔ اس کے بدلے گاؤں والے انہیں اناج، ترکاریاں پھل اور کبھی کبھی پیسے بھی دے دیا کرتے تھے۔ اس طرح پنڈت جی اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتے تھے۔

ایک دن وہ روز کی طرح پوجا پاٹ کر کے جب اپنے گھر لوٹے تو ان کی بیوی نے کہا، "اس گاؤں کے لوگ بڑے نادان ہیں۔ وہ تمہاری اور تمہارے گیان کی کچھ قدر نہیں کرتے۔ دان دینے کے معاملے میں بھی وہ دن بہ دن کنجوس ہوتے جا رہے ہیں۔ کوئی ایسا کام کرو جس سے پورے گاؤں میں تمہاری عزت کا ڈنکا پٹے۔ مان بڑھے اور ہماری غریبی بھی دور

ہو جائے ورنہ ایسے میں تو گزر بسر بھی مشکل ہے۔"

بات سچ تھی۔ اس لیے پنڈت جی کے دل میں گھر کر گئی۔ وہ دن رات اسی سوچ میں رہنے لگے کہ ایسا کون سا کام کیا جائے جس کے کرنے سے میرے دن پھریں۔ آخر ان کے دماغ میں ایک ترکیب آئی کہ ایک کویتا لکھی جائے اور جب راج کمار کی سال گرہ ہو اس دن جاکر راجا کو سُنائی جائے۔ کویتا میں راج کمار کی تعریف ہو۔ اسے سُن کر راجا بہت خوش ہوگا اور خوب سا انعام و اکرام دے گا۔ اس طرح اپنی غریبی بھی دُور ہوجائیگی اور گاؤں میں عزّت بھی بڑھ جائے گی۔

پنڈت جی کوی تو تھے نہیں۔ پھر بھی انہوں نے بڑی محنت کی اور کچھ دِنوں میں جیسے تیسے کرکے ایک کویتا لکھ ڈالی۔ راج کمار کی سال گرہ میں ابھی کچھ دن باقی تھے۔ پنڈت جی کی بیوی نے سارے گاؤں میں مشہور کر دیا کہ پنڈت جی راج دربار میں جانے والے ہیں۔ وہاں راج کمار کی سال گرہ کا جشن ہوگا۔ اس جشن میں ریاست کے سارے کوی اور گیانی آئیں گے سب اپنی اپنی کویتائیں سُنائیں گے۔ پنڈت جی بھی وہاں جائیں گے۔ راجا بھوج کے دربار سے انہیں بُلاوا آیا ہے۔

یہ باتیں سُن کر گاؤں والے بہت خوش ہوئے۔ جب پنڈت جی گاؤں سے چلنے لگے تو گاؤں والوں نے انہیں کھیر، پوریاں اور مزے مزے کی مٹھائیاں کھلائیں۔ سفر خرچ کے لیے پیسے بھی دیئے۔ گاؤں کا ایک نوجوان نندو ان کے لیے بیل گاڑی جوت کرلے آیا۔ نندو کی بیل گاڑی میں بیٹھ کر پنڈت جی بڑے ٹھاٹ باٹ سے راج دھانی کی طرف روانہ ہوئے۔

راج کمار کی سال گرہ کا جشن بہت دھوم دھام سے منایا جا رہا تھا۔
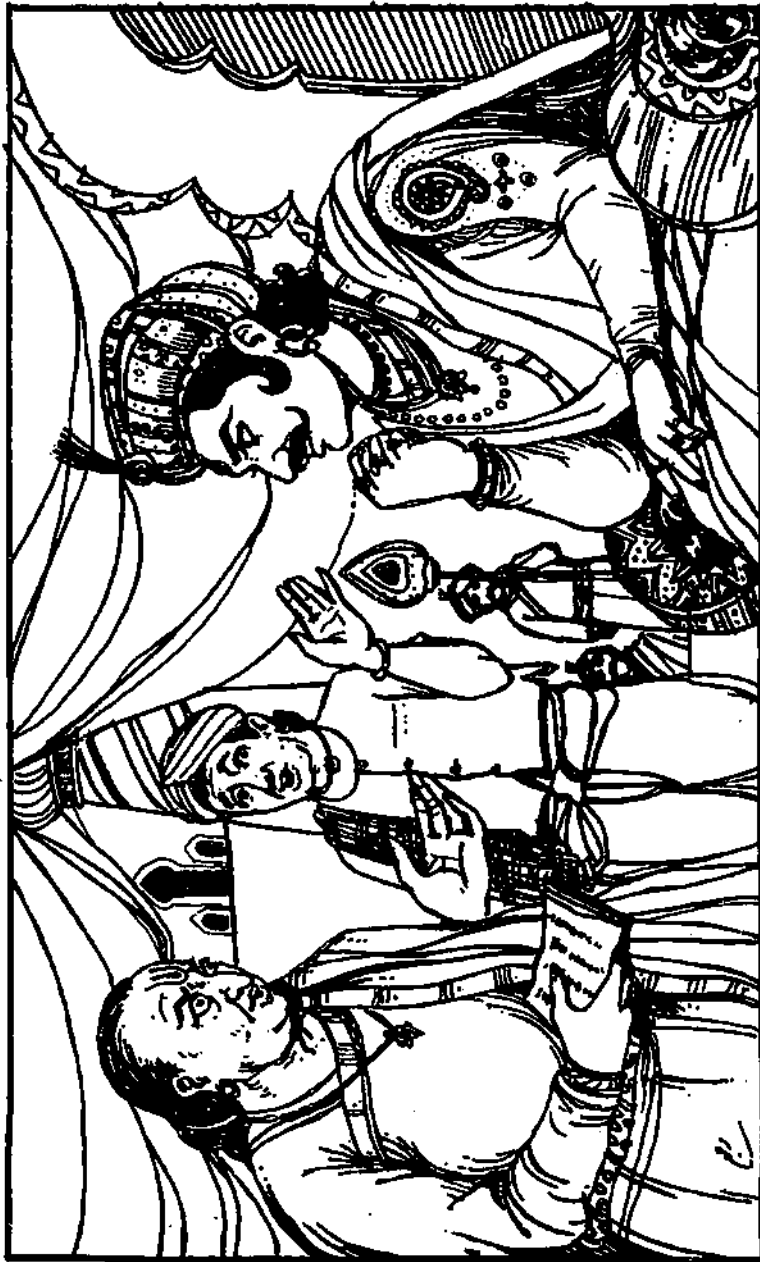
سارا شہر سجایا گیا تھا۔ ہرطرف خوشیوں کی بہار تھی۔ راج دربار تو کسی دُلہن کی طرح سجایا گیا تھا۔ وہاں بیچوں بیچ تخت پر راجا بھوج بیٹھے تھے۔ ان کے قریب ہی راج کمار کو اپنی گود میں لیے ہوئے مہارانی بیٹھی تھیں۔ بڑے بڑے نامی گرامی کوی آآ کر اپنی کویتائیں سُنا رہے تھے۔

جب پنڈت جی کا نام پُکارا گیا تو انہوں نے اپنی جیب سے کاغذ نکال کر کویتا پڑھنا شروع کی :۔

ڈھول میں ڈھول ہے سورگ کی ڈھول
اور پھول میں پھول ہے کنول کا پھول
دُوت میں دُوت ایشور کا دُوت
اور پوُت میں پوُت راجا کا پوُت

کویتا میں کوئی خوبی نہ تھی نہ تو اس میں کوئی رَس تھا اور نہ مزا۔ نہ کوئی خاص معنی تھے اور نہ گہرائی۔ اس لیے سمجھ دار لوگ اسے سُن کر چُپ ہو رہے، جو ناسمجھ تھے انہوں نے واہ واہ شروع کر دی۔

پنڈت جی نے "پوُت میں پوُت راجا کا پوُت" کہہ کر یہ سمجھا تھا کہ اس بات پر راجا خوش ہو جائے گا لیکن راجا کو ان کی کویتا پسند نہ آئی پھر بھی اس نے یہ سوچ کر کہ خوشی کا موقعہ ہے۔ پنڈت جی بڑی آس لے کر اس کے دربار میں آئے ہیں، بہت بے دلی کے ساتھ انہیں کپڑوں اور مٹھائیوں کے سات تھال اور پانسو اشرفیوں کی ایک تھیلی انعام میں دے دی۔

جس وقت پنڈت جی کویتا سُنا رہے تھے۔ اس وقت نندُو بھی عام لوگوں میں کھڑا ہوا سُن رہا تھا۔ جب پنڈت جی کو انعام دیا گیا تو نندُو

ـسے نہ رہا گیا۔ وہ اک دم چلّانے لگا :۔" راجا جی، راجا جی! مجھے بھی انعام دو۔ میں بھی کویتا سُناؤں گا۔"

ایک پھٹے حال کسان کے منہ سے ایسی بات سُن کر سب لوگ ہنسنے لگے۔ کچھ لوگ اسے پاگل سمجھے۔ پنڈت جی نے بہت غصّے اور حقارت سے اس کی طرف دیکھا۔ لیکن نندو پر ان باتوں کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ پھر بولا :۔" مَیں پڑھا لکھا آدمی نہیں، نپٹ جاہل ہوں، لیکن جیسی کویتا ابھی پنڈت جی نے سُنائی ہے اس سے اچھی مَیں سُنا سکتا ہوں۔

پنڈت جی یہ بات سُن کر غصّے میں آ گئے، اگر نندو نے یہ بات کہیں اور کہی ہوتی تو وہ مار مار کر اس کا کچُومر نکال دیتے۔ لیکن راج دربار میں وہ بے بس تھے۔ اسی لیے خون کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔

راجا نے نندو کو اپنے پاس بُلایا۔ نندو پھٹے پُرانے کپڑے، پہنے ہوئے تھا۔ اس کا حُلیہ دیکھ کر اور اس کی باتیں سُن کر سب اُسے دیوانہ سمجھ رہے تھے اس پر ہنس رہے تھے ـــــــ راجا بھوج نے جب اُسے اپنے پاس بُلایا تو سارے درباری خاموش ہو گئے اور حیرت سے اسے دیکھنے لگے۔ راجا نے سر سے پاؤں تک اس پر ایک نظر ڈالی اور بڑی نرمی سے کہا :" اپنی کویتا سُناؤ، اگر اچھی ہوئی تو ہم تمہیں بھی انعام دیں گے۔"

راجا کے منہ سے ایسی نرم بات سُن کر نندو کی ہمت بڑھی اور وہ کویتا سُنانے لگا:۔

ڈھول میں ڈھول ہے کھیت کی ڈھول
اور دان میں دان ہے کنیا دان
جَل میں جَل برسات کا، جَل

اور جوت میں جوت سورج کی جوت
پھول میں پھول ہے کپاس کا پھول
اور پوت میں پوت بس گئو کا پوت

سب لوگ نندو کی یہ تک بندی سُن کر زور زور سے ہنسنے لگے۔ راجا بھوج نے اپنا ایک ہاتھ اُونچا اُٹھا کر انہیں ہنسنے سے روکا اور بولے :۔

"سچ مچ اس کسان لڑکے کی کویتا پنڈت جی کی کویتا سے اچھی ہے"

سب لوگ حیران ہوکر ایک دوسرے کا منہ دیکھنے لگے۔

راجا بھوج نے ماگھ پنڈت کو اشارہ کیا کہ وہ ان دونوں کی کویتاؤں کا فرق سمجھائیں۔ ماگھ پنڈت راج دربار کے سب سے بڑے ودوان تھے انہوں نے کھڑے ہوکر کہا :۔

پنڈت جی نے ابھی جو کچھ سُنایا، وہ شاعری نہیں تھی۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اِدھر اُدھر کی اُڑان چھوؤ باتیں بنا کر بس راجا کو خوش کردیں تاکہ کچھ انعام وغیرہ مل جائے اور لوگوں میں عزت بھی ہو۔ اسی لیے انہوں نے "پوت میں پوت راجا کا پوت" جیسی بات کہی۔ لیکن نندو کسان کا بیٹا ہے اس کی کویتا میں زمین اور فطرت کی احسان مندی کا جذبہ ہے۔ نندو نے صرف اِن چیزوں کی تعریف کی ہے جو سب کے لیے ضروری ہوتی ہیں — جیسے برسات کا پانی، سورج کی جوت اور کپاس کا پھول جس سے بنائے ہوئے کپڑے سب کا تن ڈھانپتے ہیں۔ پھر اس نے راجا کے پوت کی بجائے گائے کے پوت یعنی بیل کی تعریف کی ہے۔ بیلوں سے کھیتی ہوتی ہے جس سے سب کو اناج ملتا ہے۔ ہر ایک کا پیٹ بھرتا ہے۔ کویتا میں سب سے بڑی چیز اس کا مقصد ہوا کرتا

ہے۔ راجا نے اسی لیے ننڈو کی کویتا کو پنڈت جی کی کویتا سے اچھا کہا ہے۔"

راجا بھوج نے حکم دیا کہ ننڈو کو پنڈت جی سے دوگنا انعام دیا جائے۔ ننڈو انعام پا کر خوشی سے پھولا نہ سمایا۔

اللہ میاں کا جلوہ

بہت دنوں کی بات ہے کسی گاؤں میں ایک لوہار رہتا تھا۔ وہ دن بھر اپنی بھٹی پر کام کرتا، گاؤں بھر کے لوگوں کے لیے اچھی اچھی چیزیں تیار کرتا، برتن اوزار اور ہتھیار بناتا تھا۔ سب لوگ اس کی بنائی ہوئی چیزیں پسند کرتے تھے۔

ایک دن وہ کسی سپاہی کے لیے ہتھیار تیار کررہا تھا۔ ہتھیار بہت تیز اور خطرناک تھا۔ لوہار نے کچھ لاپرواہی کی اور ہُوا یہ کہ ایک ہتھیار سے اس کی اپنی ناک کٹ گئی۔ اب تو وہ بہت گھبرایا۔ کٹی ہوئی ناک کو جوڑنا ممکن نہ تھا۔ بے چارہ لوہار نکٹا ہوگیا۔

کئی دن تک تو وہ اپنے گھر سے باہر نہ نکلا۔ جب کوئی گاہک آتا تو وہ گھر کے اندر ہی سے جواب دے دیتا کہ میری طبیعت خراب ہے پھر کبھی آنا۔ گاہک یہ سُن کر واپس چلے جاتے۔

کچھ دنوں کے بعد جب اس کا زخم ٹھیک ہوگیا تو اس نے آئینہ دیکھا آئینے میں اپنا چہرہ دیکھ کر اسے بہت ہی دُکھ ہوا۔ وہ سوچنے لگا اب سب لوگ اسے نکٹا کہیں گے، اس کا مذاق اڑائیں گے۔ اس سے نفرت کرینگے ایسی باتیں سوچ سوچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ بہت

دیر تک روتا رہا اور سوچنے لگا کہ اب کیا کرے ؟

آخر اس کی سمجھ میں ایک ترکیب آگئی۔ وہ اپنے گھر سے نکل کر گاؤں میں گھومنے لگا۔ وہ جہاں کہیں بھی جاتا، جان پہچان کے لوگ اسے دیکھ دیکھ کر حیران رہ جاتے۔ افسوس ظاہر کرتے اور اس کی ناک کٹ جانے کا سبب بھی پوچھتے۔

لوہار نے ایسے موقع کے لیے ایک جھوٹی کہانی گڑھ لی تھی۔ لوگوں کے پوچھنے پر وہ گردن اُونچی کرکے بڑے فخر سے کہتا :۔" بھیّا، اب تم سے کیا چھپاؤں، چالیس دن پہلے کی بات ہے۔ ایک بار صبح کے وقت مجھے ایک عجیب سا خواب دکھائی دیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک نُورانی چہرے والے بزرگ میرے سرہانے کھڑے ہیں اور کہہ رہے ہیں ـــــ "اے نیند کے ماتے، اُٹھ، نماز کا وقت ہوگیا ہے۔ نماز پڑھ اور اللہ کے نام پر اپنی ناک قربان کردے۔ اگر تُو ایسا کرے گا تو اللہ میاں تجھ پر مہربان ہوجائیں گے اور تجھے اپنا جلوہ دکھائیں گے۔"

جب مجھے تین دن تک ہر صبح یہی خواب دکھائی دیا تو میں نے اسے اپنے لیے ایک آسمانی اشارہ سمجھا اور پھر اپنی ناک قربان کردی۔ اللہ کی راہ میں تو اس کے نیک بندے اپنی جان تک قربان کردیتے ہیں اور اُف تک نہیں کرتے، سو میں نے بھی ہنسی خوشی اپنی ناک قربان کردی ناک کی قربانی کرتے ہی کیا دیکھتا ہوں کہ بزرگ نے خواب میں آکر مجھ سے جو بات کہی تھی وہ سچ ہوگئی، اللہ میاں نے مجھے اپنا جلوہ دکھایا۔

لوگ اس کی یہ باتیں سُن کر حیرت سے پوچھتے :۔" سچ! تم نے اللہ میاں کا جلوہ دیکھا ہے؟ ان کے بارے میں کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ! کیسے

ہیں اللہ میاں ؟"

لوہار کہتا :- " واہ، کیا بیان کروں - ہر طرف نُور ہی نُور دکھائی دیتا تھا۔ وہی نُور، جس کی جھلک حضرت موسیٰ نے طُور پر دیکھی تھی، اللہ میاں نے مجھ سے کہا کہ" گاؤں کے سب لوگوں سے کہہ دو، جو کوئی بھی ہمارا جلوہ دیکھنا چاہے، ہماری راہ میں اپنی ناک قربان کردے۔ہم اسے ضرور اپنا جلوہ دکھائیں گے۔"

سب لوگ دل چسپی اور حیرت کے ساتھ اس کی باتیں سُنتے اور اس کی قسمت پر رشک کرتے کہ اسے اللہ میاں نے اپنا جلوہ دکھایا ہے ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی سوچتے، کاش انہیں بھی اللہ میاں کا جلوہ دیکھنے کو ملے۔ لیکن ناک کی قُربانی کا خیال آتے ہی وہ چُپ ہوجاتے پھر بھی لوہار کی باتوں سے کچھ لوگوں پر اتنا اثر ہوا کہ انہوں نے اللہ میاں کا جلوہ دیکھنے کے لیے اپنی ناکیں قُربان کردیں لیکن قُربانی کے بعد بھی اُنہیں اللہ میاں کا جلوہ نظر نہیں آیا۔ بے چارے مُفت میں اپنی ناکیں گنوا بیٹھے۔

اب تو وہ بہت سٹ پٹائے، سمجھ گئے کہ لوہار نے ان کے ساتھ دھوکا کیا ہے اور اللہ میاں کے جلوے کی جھوٹی کہانی سُنا کر انہیں بھی اپنی ہی طرح نکٹا بنا دیا ہے۔ اُنہیں لوہار پر بہت غصہ آیا،لیکن اب کیا ہو سکتا تھا، یہ تو پہلے ہی سوچنے کی بات تھی۔

گاؤں کے لوگ ان سے بھی پوچھنے لگے :- "کیوں بھئی، کیا لوہار کی طرح تمہیں بھی اللہ میاں کا جلوہ نظر آیا ؟ "

لوگوں کے اس سوال پر پہلے تو وہ لوگ بہت گھبرائے، سوچنے لگے

ناکیں تو کٹ ہی چکی ہیں۔اب اگر لوگوں سے سچی بات، کہیں گے کہ جلوہ نظر نہیں آیا تو لوگ اور بھی ہنسیں گے، مذاق اڑائیں گے، بڑی شرمندگی ہوگی۔ یہ سوچ کر انہوں نے لوگوں سے کہا کہ ہاں ہمیں بھی جلوہ نظر آیا اور پھر وہ بھی لوہار ہی کی طرح جھوٹ موٹ کی باتیں بنانے لگے۔اس طرح دوسرے لوگوں کے دلوں میں بھی اللہ میاں کا جلوہ دیکھنے کی خواہش جگانے لگے۔ان کی اپنی ناکیں تو کٹ ہی چکی تھیں۔اس لیے اب وہ لوگ یہ چاہنے لگے کہ جو لوگ باقی بچے ہیں وہ بھی نکٹے ہو جائیں۔

ان کی باتوں میں آکر گاؤں کے کچھ اور لوگوں نے بھی اپنی ناکیں کاٹ لیں۔پھر تو ناک کی قربانی دے کر اللہ میاں کا جلوہ دیکھنے کا شوق چھوت کی بیماری کی طرح پھیلنے لگا۔ یہاں تک کہ دھیرے دھیرے سارا گاؤں اس کی لپیٹ میں آگیا۔پھر کیا تھا، تھوڑے دنوں بعد گاؤں بھر میں ایک بھی آدمی ایسا نہ بچا جس نے جلوہ دیکھنے کے شوق میں اپنی ناک نہ کاٹی ہو۔گاؤں کے سارے لوگ نکٹے ہو گئے، کچھ دنوں بعد اس گاؤں ہی کا نام "نکٹوں کا گاؤں" مشہور ہوگیا۔

نکٹوں کے گاؤں میں کوئی کسی کو نکٹا نہیں کہتا تھا، کوئی بھی نکٹے پن کو برا نہیں سمجھتا تھا کیونکہ اب تو سبھی نکٹے تھے۔

چند سال بعد اس گاؤں میں ایک مسئلہ اٹھ کھڑا ہوا۔مسئلہ بہت اہم تھا۔ کچھ لوگوں کی رائے یہ تھی کہ سارے بچوں کی ناکیں کاٹ ڈالی جائیں ورنہ بڑے ہونے کے بعد وہ ہمیں نکٹا کہیں گے، ہمیں حقیر سمجھیں گے اور ہم سے نفرت کریں گے۔لیکن بہت سے لوگ ایسے بھی تھے جو اس بات کے حق میں نہ تھے۔اس لیے یہ مسئلہ گاؤں کے مکھیا کے سامنے پیش کیا

گیا۔ مکھیا نے پنچایت بلوائی۔ پنچایت میں اس مسئلے پر بڑی دیر تک بڑی بحث ہوئی۔ آخر میں یہ طے پایا کہ بچوں کی ناکیں نہ کاٹی جائیں۔ ہمارا حال تو جو ہُوا سو ہُوا لیکن بچوں کو اس سے بچانا چاہیے۔ اس طرح پنچایت نے جو فیصلہ کیا اس کی وجہ سے سارے بچوں کی ناکیں کٹنے سے بچ گئیں۔

پھر یہ ہوا کہ دن گزرتے گئے، بچے دھیرے دھیرے بڑے ہوتے گئے۔ جب کبھی وہ اپنے بڑوں کی کٹی ہوئی ناکیں دیکھتے اور ان کے بارے میں سوچتے تو انہیں بڑی حیرت ہوتی۔ جب وہ اپنے بڑوں سے ان کی ناکوں کے بارے میں کچھ پوچھتے تو بڑے انہیں بھی وہی جواب دیتے :- "ہم نے اللہ میاں کا جلوہ دیکھنے کے لیے اپنی ناک قربان کر دی۔ یہ جواب سُن کر بچے خاموش ہوجاتے اور کچھ سوچنے لگتے۔

گاؤں کے مکھیا کا لڑکا بڑا چنچل اور ضدی تھا۔ ایک دن ایسا ہوا کہ وہ مچل گیا اور ضد کرنے لگا، اور بولا کہ مَیں بھی اپنی ناک کی قربانی دے کر اللہ میاں کا جلوہ دیکھوں گا۔ مکھیا خود ناک کٹائے بیٹھا تھا۔ اس نے سوچا کہ اگر ناک کاٹنے اور اللہ میاں کا جلوہ دیکھنے والا چکّر پھر سے چل پڑا تو گاؤں کے سارے بچے نکٹے ہوجائیں گے اس لیے اس نے اپنے لڑکے کو بہلانے پھُسلانے کی کوشش کی۔ پھر اسے بہت سمجھایا بجھایا لیکن لڑکا ضدی تھا، اپنی بات پر اَڑ گیا۔ مکھیا نے اسے لالچ بھی دی لیکن لڑکا نہ مانا۔ اس نے غصّے میں آکر لڑکے کی خوب پٹائی کر دی۔ لڑکا پھر بھی نہ مانا، وہ اپنی ضد پر اڑ گیا تھا۔ آخر ہار کر مکھیا نے اُسے ساری بات بالکل سچ سچ بتا دی۔

لڑکے کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ اُداس ہوگیا۔ اس کے دل میں اپنے بڑوں سے نفرت پیدا ہوگئی۔ وہ سوچنے لگا' کتنے کینے ہیں یہ لوگ اپنا نقصان ہُوا تو ہُوا انہیں جان بوجھ کر دوسروں کا نقصان تو نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اپنی ناک کٹ گئی تو دوسروں کی ناکیں بھی کٹوا دیں۔ ایسا کرکے آخر اُنہیں ملا کیا ؟' لڑکا جتنا زیادہ سوچتا تھا اس کے دل میں اپنے بڑوں سے اتنی ہی زیادہ نفرت ہوتی جاتی تھی۔ جب اس نے یہ بات اپنے دوستوں کو بتائی تو انہیں بھی بڑوں کی اس حرکت پر بہت افسوس ہوا۔ ان کے دلوں میں بھی بڑوں سے نفرت پیدا ہوگئی۔ اپنے بڑوں کے لیے چھوٹوں کے دلوں میں جو عزت ہوا کرتی ہے وہ اس بات سے ختم ہوگئی۔ کئی لڑکے تو بڑوں سے نفرت کرنے اور ان سے چڑنے لگے، کئی لڑکوں نے ان کا کہنا ماننے سے انکار کردیا اور ان کی ہر بات کی مخالفت کرنے لگے۔

چھوٹوں کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھ کر بڑوں میں کھلبلی مچ گئی۔ سب کہنے لگے کہ گاؤں کے نوجوان بگڑتے جارہے ہیں۔ وہ نہ تو بڑوں کی عزت کرتے ہیں اور نہ ان کا کہنا ہی مانتے ہیں۔ وہ باغی ہوتے جارہے ہیں۔ اس لیے انہیں کسی نہ کسی طرح راہ پر لانا چاہیے، انہیں کسی طرح سدھارنا چاہیے۔

گاؤں کے تمام بڑے اپنے چھوٹوں کو قابو میں لانے کی ترکیبیں سوچنے لگے۔ لیکن وہ جو بھی کوشش کرتے ناکام ہوجاتی۔ بڑوں نے بہتیری کوششیں کیں لیکن چھوٹوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ گاؤں کے نوجوان ان کے لیے ایک ایسی اُلجھن بن گئے جو کسی طرح بھی سُلجھتی

ہو گئی۔ چھوٹوں کا اپنے بڑوں پر سے بھروسہ ہی اُٹھ گیا تھا۔ یہ بات تو اپنی جگہ پر سچ تھی لیکن بڑوں کا اپنے آپ پر بھی کوئی بھروسہ نہ رہ گیا تھا کیونکہ وہ ہزار کوششوں کے بعد بھی چھوٹوں کو اپنے قابو میں نہ لا سکے تھے۔

دن گزرتے گئے، بڑوں اور چھوٹوں کے بیچ کی دوری بھی بڑھتی گئی سارے بڑے پریشان تھے اور اس حالت سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتے تھے لیکن چھٹکارے کا کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا۔ ان کو اپنے گناہوں کی سزا مل رہی تھی کیونکہ سب نے اللہ میاں کے جلوے کی جھوٹی باتیں کرکے ایک دوسرے کو دھوکا دیا تھا۔

ایک دن اس گاؤں سے ایک بزرگ کا گزر ہوا، وہ بزرگ بہت نیک اور اللہ والے آدمی تھے۔ انہوں نے جب گاؤں والوں کی ایسی حالت دیکھی تو انہیں ان سب پر بڑا ترس آیا۔ وہ گاؤں والوں کو اس مصیبت سے نجات دلانے کے لیے اسی گاؤں میں رُک گئے۔

اسی سال جب بڑی رات آئی تو گاؤں میں بڑی خوشیاں لائی۔ وہ بزرگ گاؤں کے سارے بڑوں کو اپنے ساتھ لے کر مسجد میں گئے اور ان سے کہا ــــــ "آج بڑی برکتوں والی رات ہے۔ خوب عبادت کرو اور خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو، خدا بگڑے کام بناتا ہے، وہ تمہاری بگڑی بھی بنا دے گا۔"

گاؤں کے سارے بڑوں نے رات بھر خوب عبادت کی، خوب رو رو کر خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگی۔ جب انہوں نے صاف دل سے دعا مانگی تو خدا نے ان کی دعا قبول کرلی اور ان کے چہروں

پر پھر سے تاکیں نکل آئیں۔

اپنے چہروں پر ناکیں پاکر وہ پھولے نہ سمائے۔ سب نے مل کر عہد کیا کہ اب وہ کسی کو دھوکا نہ دیں گے، کبھی جھوٹ نہ بولیں گے اور کسی کا بُرا نہ چاہیں گے کیونکہ بُرائی کا انجام ہمیشہ بُرا ہوا کرتا ہے۔

سب سے بڑا دردمند

ایک تھا بادشاہ، بہت نیک اور انصاف پسند، ساری رعایا اس سے بہت خوش تھی اور اسے بے حد چاہتی تھی۔ بادشاہ بھی رعایا کا بڑا خیال رکھتا تھا۔ اس کی حکومت میں کوئی دُکھی نہ تھا۔

ایک مرتبہ بادشاہ بہت بیمار ہوا اتنا بیمار کہ جینے کی کوئی آس نہ رہی۔ شاہی حکیموں نے اس کے علاج کے سلسلے میں ہزاروں کوششیں کیں لیکن ان کی تمام تدبیریں اُلٹی ہوگئیں۔ دوا نے کچھ کام نہ کیا۔ آخر میں نااُمید ہوکر سب نے دُعا کا سہارا لیا۔ تمام مسجدوں اور مندروں میں بادشاہ کی صحت یابی کے لیے دعائیں مانگی گئیں۔ قیدیوں کو رہا کردیا گیا۔ اَن گنت غلاموں کو آزادی ملی۔ غریبوں، محتاجوں، یتیموں اور بیواؤں کو کھانے اور کپڑے تقسیم کیے گئے۔ دھیرے دھیرے بادشاہ کی طبیعت سُدھرنے لگی۔ کچھ دنوں کے بعد وہ اچھا ہوگیا۔ سارے شہر میں چراغاں کیا گیا۔ خوب خوشیاں منائی گئیں۔

بادشاہ کو بیماری سے شفا تو مل گئی لیکن اب راج پاٹ کے کاموں سے اس کا جی اُچاٹ ہوگیا۔ وہ سوچنے لگا کہ اس زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔ اس

لیے اب اپنی عمر کے باقی دن خدا کی عبادت اور اس کی یاد میں گزاروں۔ یہ سوچ کر ایک دن اس نے چاروں شہزادوں کو اپنے پاس بلایا اور ان سے کہنے لگا: "اب میں اپنی زندگی کے باقی دن خدا کی یاد میں گزارنا چاہتا ہوں میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تم میں سے کس کو اپنا جانشین اور اس تخت کا وارث بناؤں کیونکہ تم چاروں مجھے یکساں طور پر پیارے ہو۔ تم سب میری آنکھوں کے تارے ہو، بہت نیک اور لائق ہو ــــ اس لیے میں نے ایک ترکیب سوچی ہے، تم چاروں بھائیوں میں سے جو بھی سب سے بڑے دردمند انسان کو ڈھونڈ کر میرے پاس لائے گا، یہ تخت اور تاج اسی کو دے دوں گا۔ اس کام کے لیے مَیں تمہیں ایک سال کا وقت دیتا ہوں۔"

بادشاہ کی بات سُننے کے بعد شہزادوں نے سفر کی تیاری شروع کر دی۔ اور اگلے دن چاروں شہزادے چار سمتوں میں سفر پر روانہ ہوئے۔

پہلا شہزادہ جُنوب کی طرف گیا تھا، وہ تین مہینے بعد لوٹ آیا۔ اس کے ساتھ ایک سوداگر تھا۔ شہزادے نے سوداگر کو بادشاہ کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا ــــ "ابّا حضور، یہ شخص ایک بڑا سوداگر ہے۔ اس نے خدا کی راہ میں اپنی ساری دولت خرچ کر دی ہے۔ اس نے نمازیوں کے لیے جا بجا مسجدیں تعمیر کروائی ہیں اور مسافروں کے ٹھہرنے کے لیے اَن گنت سرائیں بنوائی ہیں۔ یہ آدمی پانچ وقتوں کی نماز پڑھتا ہے اور سات مرتبہ حج بھی کر چکا ہے۔ اس سے بڑا دردمند آدمی شاید ہی کہیں ملے۔"

بادشاہ نے کہا: "ایسے لوگ دُنیا میں کم ہوتے ہیں، واقعی یہ شخص غنی اور خُلوص مند ہے۔ اسے شاہی محل میں ٹھہرایا جائے۔"

دوسرا شہزادہ شمال کی سمت گیا تھا۔ وہ چھ مہینے کے بعد لوٹ آیا۔

اس کے ساتھ ایک سنجیدہ اور باوقار آدمی تھا جس کے چہرے پر علم کا نور چمک رہا تھا۔ دوسرے شہزادے نے اس آدمی کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرتے ہوئے کہا — "ابا حضور، یہ شخص بہت بڑا عالم ہے۔ اس نے بے شمار کتابیں پڑھی ہیں۔ مذہب کی ساری باریکیوں کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ اس میں سر سے پیر تک خوبیاں ہی خوبیاں ہیں۔ یہ کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ سب کے ساتھ نیکی اور بھلائی کا برتاؤ کرتا ہے۔ کسی جاندار کو نہیں ستاتا۔ غرض یہ کہ اس کے کردار میں ذرا سی بھی بُرائی نہیں ہے۔ اس سے بڑا دردمند اور قابل آدمی کوئی اور نہ ہوگا۔"

بادشاہ نے کہا: "یہ بہت خوبیوں کا مالک ہے اس کے کردار میں کوئی خرابی نہیں۔ اس کے علم میں بھی کسی کو کلام نہیں۔ بے شک یہ ایک نیک اور عاقل آدمی ہے۔ اسے عزت کے ساتھ شاہی محل میں ٹھہرایا جائے۔"

دوسرے شہزادے کو آتے ہوئے ابھی تین ہی مہینے گزرے ہوں گے کہ تیسرا شہزادہ اپنے سفر سے لوٹ آیا۔ وہ مغرب کی سمت سے آیا تھا۔ اس کے ساتھ ایک فقیر تھا۔ شہزادے نے اسے بادشاہ کے سامنے پیش کرتے ہوئے کہا — "ابا حضور، یہ بزرگ ایک خدا رسیدہ فقیر ہیں۔ سُنا ہے کسی زمانے میں ایک ملک کے بادشاہ تھے۔ لیکن خدا کی راہ میں تخت و تاج اور ملک و مال چھوڑ کر فقر و فاقہ کی زندگی اختیار کرلی۔ اب تو یہ حال ہے کہ رُوکھی سُوکھی جو بھی ملے کھا لیتے ہیں اور رات دن عبادت کرتے رہتے ہیں۔ یہ اپنی زندگی کا ایک ایک لمحہ خدا کی یاد میں صرف کرتے ہیں۔ عبادت اور قناعت میں کوئی ان کی برابری نہیں کرسکتا۔ میری نظر میں سب سے بڑے دردمند انسان یہی ہیں۔"

بادشاہ نے کہا ـــــــ "تم ایک بہت اچھے انسان کو لے کر آئے ہو۔ ان کی عبادت اور قناعت نے مجھے بھی متاثر کیا۔ واقعی یہ ایک عابد اور زاہد آدمی ہیں۔ انہیں عزّت اور احترام کے ساتھ شاہی محل میں ٹھہراؤ۔"

اب سب کو چوتھے شہزادے کا انتظار تھا۔ وہ مشرق کی سمت گیا تھا اور اب تک واپس نہیں آیا تھا۔ ایک سال پورا ہونے میں ابھی ایک ہفتہ باقی تھا۔ ہفتے کے آخری دن چوتھا شہزادہ واپس ہوا۔ اس کے ساتھ ایک دُبلا پتلا بھکاری نما آدمی تھا جس کے کپڑے پُرانے اور میلے تھے۔ ان میں جگہ جگہ پیوند لگے ہوئے تھے۔ اس کے سر پر ٹوپی تھی نہ پیر میں جُوتی۔ وہ ڈری ڈری آنکھوں سے اِدھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ تینوں شہزادے اسے دیکھ کر ہنسنے لگے۔

چوتھے شہزادے نے جب اس آدمی کو بادشاہ کے حضور میں پیش کرنا چاہا تو وزیرِ اعظم اسے حقارت سے دیکھ کر بولے: "شہزادے، تم یہ کس بھک منگے کو پکڑ لائے ہو؟ ذرا دربار کا اور اپنا تو خیال کیا ہوتا۔ یہ شخص دربار میں لانے کے قابل نہیں ہے۔ اسے باہر نکال دو۔"

شہزادے نے ان کی سُنی اَن سُنی کرتے ہوئے بادشاہ سے کہنا شروع کیا ـــــــ "ابّا حضور! میں آپ کے حکم کے مطابق سب سے بڑے دردمند انسان کی تلاش میں ایک سال تک در بہ در بھٹکتا پھرا ہوں۔ اس دنیا میں درد مند انسانوں کا ملنا ہی مشکل ہے تو پھر سب سے بڑے دردمند انسان کی تلاش تو اور بھی مشکل ہے۔ بہرحال ایک سال کی مسلسل تلاش کے بعد مجھے جو آدمی ملا ہے۔ اسے لے کر میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔ ملک تاشرمان میں شہر کے لوگوں نے ایک کوڑھی کو اس

ڈر سے کہ کہیں اس کی بیماری اوروں کو نہ لگ جائے ، شہر کے باہر لے جاکر ڈال دیا تھا۔ جہاں پڑے پڑے بھوک اور پیاس کے مارے وہ ایک دو دن میں مرجاتا۔ اتفاق سے اس آدمی کا جسے آپ دیکھ رہے ہیں، اُدھر سے گذر ہوا اس نے کوڑھی کو اس حال میں پاکر اسے اُٹھایا۔ دلاسہ دیا، اس کے زخموں کو صاف کرکے ان پر پٹیاں باندھیں اور پھر شہر جاکر کوڑھی کے لیے کھانا لایا اور اپنے ہاتھوں سے اسے کھلایا۔ کئی دن تک اس کا یہی معمول رہا۔ اس کے پاس جو کچھ روپے پیسے تھے وہ سب ختم ہو گئے۔ مجبوراً بے چارہ محنت مزدوری کرنے لگا اور اس طرح سے جو پاتا، اس سے کوڑھی کے لیے کھانا اور دوائیں خرید لاتا۔ وہ روزانہ کوڑھی کو کھانا کھلاتا۔ اس کے زخم صاف کرتا اور ان پر مرہم لگاتا۔ زندگی اور موت تو خدا کے ہاتھ میں ہے لیکن اس کی بے لوث خدمت، ہمدردی، اور کوششوں سے اس کوڑھی نے ایک نئی زندگی پائی۔ یہ شخص خود بے حد غریب اور نادار ہے اور "دردمند" لفظ کے معنی بھی نہیں جانتا لیکن اس کے دل میں دردمندی کا جذبہ موجود ہے اسی لیے میں اسے اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔

بادشاہ یہ سُن کر بہت خوش ہوا اور بولا: "شاباش، میرے بچے! تم سب سے بڑے دردمند انسان کو ڈھونڈ کر لانے میں کامیاب ہوئے ہو۔ آج سے یہ تخت و تاج اور راج پاٹ تمہارا ہے۔

راجہ بھوج اور بُڑھیا

راجا بھوج اور گنگو تیلی والی کہاوت تو سبھی نے سُنی ہوگی۔ یہ بھی سُنا ہوگا کہ راجا بھوج کے دربار میں ایک بہت بڑے گیانی ہوئے ہیں، جو ماگھ پَنڈِت کہلاتے تھے۔ وہ راجا کے دوست بھی تھے۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ راجا بھوج اور ماگھ پَنڈِت سیر کرنے گئے۔ گھوڑوں کو دوڑاتے اور باتیں کرتے کرتے وہ بہت دُور نکل گئے۔ اتنی دُور کہ لوٹتے وقت انہیں راستہ بھی یاد نہ رہا۔

راجا بھوج بولے: "پَنڈِت جی، ایسا لگتا ہے کہ ہم راستہ بھول گئے ہیں۔ کسی سے پوچھ لیں تو اچھا ہے۔"

وہاں قریب ہی ایک بُڑھیا کھڑی تھی، وہ اپنے کھیت کی رکھوالی کر رہی تھی۔ ماگھ پنڈت نے اسے دیکھ کر کہا: "کیوں نہ اسی بُڑھیا سے راستہ پوچھ لیں۔"

راجا بھوج نے جواب دیا: "ٹھیک ہے چلو۔"

دونوں بڑھیا کے پاس پہنچے اور بڑے ادب سے اسے سلام کیا۔ بُڑھیا نے انہیں دعائیں دیں۔ دونوں نے بُڑھیا سے پوچھا: "مائی، یہ راستہ کہاں جائے گا؟"

بڑھیا ان کا سوال سن کر ہنسی اور بولی ـــــ " کیسی مورکھوں کی سی بات کرتے ہو؟ یہ راستہ تو کہیں بھی نہیں جائے گا۔ یہیں رہے گا۔ اس کے اوپر چلنے والے البتہ جائیں گے لیکن بھائی یہ تو بتاؤ کہ تم کون ہو؟ "

"بہن، ہم تو راہ گیر ہیں" راجا بولا۔

یہ سن کر بڑھیا بولی:۔" راہ گیر تو دو ہوتے ہیں، ایک سورج جو دن بھر چلتا رہتا ہے، دوسرا چاند جو رات بھر چلتا ہے۔ سچ بتاؤ بھائی، تم کون سے راہ گیر ہو؟ "

"بہن، ہم تو مہمان ہیں" ماگھ پنڈت نے کہا۔

مہمان تو اس دنیا میں بس دو ہوتے ہیں۔ ایک دولت جو کسی کی نہیں ہوتی۔ دوسری جوانی، جو کسی کی نہیں رہتی۔ بھائی سچ سچ بتاؤ، تم کون ہو؟"

راجا بھوج نے جواب دیا:۔" مائی، سچ یہ ہے کہ ہم راجا ہیں"

بڑھیا یہ سن کر بھی متاثر نہ ہوئی، بولی:۔" میں نے سنا ہے کہ راجا تو بس دو ہوتے ہیں، ایک تو راجا اِندر جو بارش کے ذریعے سب کو جان دیتا ہے۔ دوسرا یَم راج، جو سب کی جان لیتا ہے۔ تم کون سے راجا ہو؟ "

"بہن، ہم تو مجبور ہیں" ماگھ پنڈت نے کہا۔

مجبور تو دو ہوتے ہیں۔ ایک زمین اور دوسری عورت۔ لیکن تم تو نہ زمین ہو اور نہ عورت۔ بھائی، کچھ تو بولو کہ تم کون ہو؟ بڑھیا نے پھر سوال کیا۔

"مائی، ہم تو غریب ہیں" راجا بولا۔

غریب بھی دو ہوا کرتے ہیں۔ ایک تو بکری کا جایا بکرا اور دوسری لڑکی۔"

بڑھیا کہنے لگی۔

بُڑھیا کے سوال اور جواب سُن سُن کر راجا بھوج اور ماگھ پنڈت دونوں ہی تنگ آگئے۔ آخر انھوں نے اپنی ہار مانتے ہوئے کہا :۔"مائی ہم تو ہارے ہوئے ہیں۔"

بُڑھیا ہنس کر بولی :۔"ہارے ہوئے بھی دو ہی ہوتے ہیں، ایک تو قرض دار اور دوسرا بیٹی کا باپ۔ تم ان میں سے کون ہو؟"

اس پر دونوں بولے :۔"ہم کچھ بھی نہیں جانتے کہ ہم کیا ہیں، کون ہیں؟ جاننے والی تو بس تُو ہی ہے۔"

یہ سُن کر بُڑھیا مسکرائی اور کہنے لگی :۔ یہ میرے سر کے بال دیکھ رہے ہو یہ میں نے دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں، میں نے دنیا دیکھی ہے، ایسی نادان نہیں کہ تم سے دھوکا کھا جاؤں۔ میں تم دونوں کو خوب پہچانتی ہوں، سمجھے؟"

راجا بھوج اور ماگھ پنڈت نے حیران ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھا پھر بڑھیا سے پُوچھا——"تو پھر تم ہی بتاؤ کہ ہم کون ہیں؟"

بُڑھیا نے راجا کی طرف اشارہ کر کے کہا :۔" یہ راجا بھوج ہیں اور تم ماگھ پنڈت ہو۔ بولو، سچ کہتی ہوں نا؟"

دونوں نے کہا :۔" مائی، تم سچ کہتی ہو۔"

یہ سُن کر بُڑھیا پھر ہنسنے لگی اور اس نے ایک راستے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے دونوں سے کہا——"وہ دیکھو، وہی اُجین کا راستہ ہے۔"

وکرم کا انصاف

راجا وِکرم کا نام کون نہیں جانتا، وہ بڑا بہادر، عقل مند اور انصاف پسند راجا تھا، اس کی کہانیاں آج بھی لوگوں کی زبان پر ہیں۔

راجا وکرم کے راج میں کیا امیر، کیا غریب، سب خوش حال اور مطمئن تھے۔ کسی کو کوئی دُکھ نہ تھا کیونکہ راجا ہمیشہ سب لوگوں کی بھلائی کے کاموں میں لگا رہتا تھا۔ اس کے راج میں کہیں کوئی بھوکا، ننگا یا دُکھی نظر نہ آتا تھا۔ کسی کو کسی کا ڈر نہ تھا۔ شیر اور بکری ایک گھاٹ پانی پیتے تھے۔

راجا وِکرم ہر روز شام کے وقت بھیس بدل کر شہر میں گھوما کرتا تھا۔ ایک عام آدمی کے رُوپ میں وہ سب لوگوں سے ملتا۔ ان سے بات چیت کرتا اس طرح اُسے سب باتوں کی خبر رہتی تھی۔ کہیں بھی کوئی گڑ بڑ یا بے انصافی ہوتی تو وہ اسے دُور کر دیتا۔ اگر کبھی سرکاری افسر یا کارندے کسی کے ساتھ ظُلم یا زیادتی کرتے تو راجا انہیں بھی سخت سزا دیتا تھا تاکہ آئندہ کسی کو ایسا کرنے کی ہمت نہ ہو۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے۔ راجا وِکرم ہمیشہ کی طرح بھیس بدل کر گھومنے کے لیے نکلا۔ اس نے سپاہی کا بھیس بدلا تھا۔ اس بدلے ہوئے بھیس میں وہ

بالکل سپاہی جیسا ہی لگ رہا تھا۔ راجا نے سواری کے لیے ایک گھوڑا لیا اور اپنے ساتھ دو سپاہیوں کو لے کر ایک طرف چل پڑا۔

مالوے کی راتیں بڑی خوش گوار اور سہانی ہوتی ہیں اور پھر اگر چاندنی رات ہو، آسمان میں چودھویں کا چاند چمک رہا ہو، اس کے اردگرد بے شمار ستارے دمک رہے ہوں، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی ہوں، جنگل، پہاڑ اور جھرنے میٹھے میٹھے گیت گا رہے ہوں۔ ساری فضا ناگ چمپا اور رات رانی کے پھولوں کی سی خوشبوؤں سے مہک رہی ہو تو آدمی پر بے خودی کا عالم طاری ہو جاتا ہے اور وہ اسی ماحول میں کھو جاتا ہے۔

راجا وکرم کے دل پر بھی اس حسین اور دل کش ماحول کا بہت اثر ہوا۔ اس نے اپنے ہاتھ سے باگ چھوڑ دی اور گھوڑے کو ایڑ لگائی۔ پھر کیا تھا، گھوڑا ہوا سے باتیں کرنے لگا اور ذرا سی دیر میں کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ راجا کے ساتھ آنے والے دونوں سپاہی بہت پیچھے رہ گئے۔ راجا بھی ایسا مست ہوا کہ اسے ساتھیوں کے چھوٹ جانے کا کچھ خیال ہی نہ رہا۔

جنگل میں بہت دور نکل جانے کے بعد جب گھوڑا ایک ہرے بھرے کھیت سے گزرنے لگا تو راجا جیسے نیند سے چونک پڑا۔ تب اسے خیال آیا کہ وہ بے خیالی میں رستے سے بھٹک کر نہ جانے کہاں آ گیا ہے اور اس کا گھوڑا لہلہاتے ہوئے کھیت میں بڑے مزے سے چلا جا رہا ہے۔

راجا نے باگ جو کھینچی تو گھوڑا مچل کر ایک دم رک گیا۔ راجا دھم سے گھوڑے سے کود پڑا۔ گھوڑے کے مچلنے اور راجا کے کودنے سے کھیت کے کچھ پودے ٹوٹ گئے۔ آواز سن کر دور سے کوئی چلّایا: "او گھوڑے والے میرا کھیت کیوں روند رہا ہے، وہیں ٹھہر میں آ رہا ہوں۔"

راجا وکرم اپنی جگہ ٹھہر گیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا۔ کھیت کے بیچوں بیچ درختوں کی موٹی موٹی شاخوں پر ایک چھوٹی سی جھونپڑی بنی ہوئی تھی۔ کھیت کا رکھوالا اسی کے مچان پر سے اُتر کر راجا کی طرف چلا آرہا تھا۔

"کون ہو تم؟ اور اتنی رات کو یہاں کیا کرنے آئے ہو؟" کسان نے چلّا کر پوچھا۔

"دیکھتا نہیں، میں راجا کا سپاہی ہوں، ذرا ادب سے بات کر۔" راجا وکرم نے اسے رُعب دکھانے کے لیے اکڑ کر کہا۔ کیونکہ وہ اس وقت ایک سپاہی کے بھیس میں تھا۔

"تم کہاں کے سپاہی ہو؟ جانتے نہیں یہ اُجّین نگری ہے! یہاں راجا وکرم کا راج چلتا ہے۔" کسان نے کہا۔

"جانتا ہوں۔" — راجا نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

کسان نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہا — "لباس سے تو تم راجا وکرم ہی کے سپاہی لگتے ہو۔"

"ہاں، میں راجا وکرم ہی کا سپاہی ہوں۔" راجا بولا۔

"پھر تو تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ راجا وکرم کے راج میں سب کے لیے ایک ہی قانون ہے۔ امیر، غریب، وزیر، فقیر، چور، سپاہی، راجا، پرجا، قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ تم سپاہی ہو تو کیا ہوا اپنے کیے کی سزا تو تمہیں بھگتنی ہی پڑے گی۔" کسان نے اونچی آواز میں کہا۔

"کس بات کی سزا؟ میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟" راجا نے پوچھا۔

"ایک تو بھرے کھیت میں گھوڑا ڈال کر بے دردی سے پودوں کو روند ڈالا اور اُلٹے مجھ سے ہی پوچھ رہے ہو کہ کس بات کی سزا۔" کسان نے غصّہ

گہری نظروں سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔
"تمہیں اپنے کیے کی سزا بھگتنی ہوگی ورنہ میں تمہیں پکڑ کر راج دربار میں لے جاؤں گا اور مہاراج سے تمہاری شکایت کر کے سخت سزا دلاؤں گا۔"
"یہ ستم نہ کرنا بھیا، مجھ سے غلطی تو ہو ہی گئی ہے پتہ نہیں مہاراج کیا سزا دیں۔ میں غریب سپاہی بال بچے دار آدمی ہوں۔ مُفت مارا جاؤں گا۔ تم چاہو اپنے ہاتھ سے مجھے سزا دے دو، چاہو تو ایک مہینے تک دن رات اپنے کھیت میں کام کرالو، لیکن مہاراج سے میری شکایت نہ کرنا——" راجا نے ایسے دبے ہوئے انداز میں لجاجت کے ساتھ کہا جیسے وہ کسان کی دھمکی سے ڈر گیا ہو۔
کسان نے کہا——"بے وقوف، اتنا ڈرتا ہے تو ایسا کام ہی کیوں کیا؟ میں تجھ سے ایک مہینے تک دن رات کام نہیں لے سکتا۔"
"کیوں؟" راجا نے پوچھا۔
"اس لیے کہ اگر میں ایسی بے انصافی کا کام کروں گا تو راجا میری کھال کھنچوادے گا۔"
"تو پھر مجھے معاف کر دو۔" راجا نے کہا۔
"بے رحم، تُو نے کیسے ہرے بھرے پودوں کو کچل ڈالا ہے۔ تجھے کون معاف کرے گا؟ تجھے معاف کرنا بھی تو بے انصافی ہوگی۔!"
"سزا کے طور پر تم مجھ سے کام لینے کے لیے بھی تیار نہیں اور معاف بھی نہیں کرتے تو آخر کیا چاہتے ہو؟ کچھ تو پتہ چلے!"
"تم نے جتنا قصور کیا ہے، اتنی ہی سزا دینا چاہتا ہوں——" کسان نے سادگی سے جواب دیا۔

"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا!" راجا نے کہا۔

"ابھی سمجھائے دیتا ہوں"—— یہ کہتے ہوئے کسان نیچے جھک کر ان پودوں کو گننے لگا جو گھوڑے کے چلنے اور راجا کے کودنے سے ٹوٹ گئے تھے۔ کُل ملاکر گیارہ پودے ٹوٹے تھے۔ کسان انہیں گن لینے کے بعد راجا کی طرف مڑا :۔" سپاہی جی، تم نے میرے کھیت کے گیارہ پودے برباد کیے ہیں۔ یہ بڑے ہوتے تو ان سے آدمی اور جانور دونوں اپنی غذا حاصل کرتے۔ تم نے دونوں کے رزق کا نقصان کیا ہے۔ رزق کا نقصان کرنے والے کو کبھی معاف نہیں کیا جاسکتا، اس لیے میں سزا کے طور پر تمہیں گیارہ کوڑے ماروں گا۔ لو اب سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔"

راجا بولا :" یہ تو بے انصافی کی بات ہوئی۔ انصاف کا نام لے کر تم میرے ساتھ نا انصافی کر رہے ہو۔"

کسان نے چونک کر پوچھا :۔" وہ کیسے۔؟"

"اس لیے کہ مجھ سے تو صرف دو تین ہی پودے ٹوٹے ہوں گے۔ ان کی سزا تم مجھے دے سکتے ہو۔ باقی پودے گھوڑے سے ٹوٹے ہیں اس لیئے ان کی سزا گھوڑے کو دی جائے۔" راجا نے کسان سے کہا۔

کسان بولا :۔" مگر اس وقت گھوڑے پر تم سوار تھے اور اس کی باگ تمہارے ہاتھ میں تھی۔ اس لیے قصور تمہارا ہی مانا جائے گا۔"

اگر تمہارا انصاف یہی ہے تو پھر یہی سہی۔ میں تمہارے ہاتھوں گیارہ کوڑے کھانے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن راجا سے میری شکایت نہ کرنا ورنہ میری نوکری جاتی رہے گی۔"

یہ کہہ کر راجا نے اپنی پیٹھ کسان کی طرف کردی اور کوڑے کھانے کے

لیے تیار ہوگیا۔ کسان نے راجا کی پیٹھ پر سڑا سڑ کوڑے مارنے شروع کر دیئے۔ جیسے ہی راجا کی پیٹھ پر کوڑا پڑتا، درد کے مارے اس کے منہ سے چیخ نکل جاتی۔ آنکھوں میں آنسو بھر آتے اور وہ درد کی شدت سے تڑپ اُٹھتا۔

ابھی اُس کو سات کوڑے ہی لگے ہوں گے کہ راجا کے وہ دونوں سپاہی جو رستے میں بچھڑ گئے تھے اسے ڈھونڈتے ہوئے ادھر آ نکلے۔ انہوں نے جو دیکھا کہ گاؤں کا ایک معمولی کسان راجا کی پیٹھ پر کوڑے برسا رہا ہے تو وہ غصے سے بے قابو ہو گئے اور اپنی تلواریں سونت کر کسان کی طرف بڑھے اس سے پہلے کہ وہ کسان کا سر تن سے جدا کر دیں۔ راجا نے چلّا کر کہا:۔ خبردار! اگر اس کسان کا بال بھی بیکا ہوا تو تم دونوں کی خیر نہیں۔"

دونوں سپاہی سہم کر رُک گئے اور بولے:۔" مہاراج ہم آپ کا نمک کھاتے ہیں، پھر بھلا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی آپ کی پیٹھ پر کوڑے برسائے ہم خاموش کھڑے دیکھتے رہیں۔ ہمیں حکم دیجیے۔ ابھی اس بدذات، کمینے کا سر کاٹ کر آپ کے قدموں میں ڈالے دیتے ہیں۔"

راجا بولا:۔" وکرم اتنا کمزور نہیں کہ ایک مریل کسان کو نہ مار سکے اور اسے مارنے کے لیے تمہارا سہارا لے۔ ظالموں کے سر کاٹنے کے لیے میرے بازوؤں میں بہت بل ہے۔ لیکن یہاں انصاف کا معاملہ ہے۔ بات ہی دوسری ہے۔

کسان نے جب وکرم کا نام سُنا تو جیسے اس کے پاؤں تلے سے زمین ہی کھسک گئی۔ اس کی حالت ایسی ہو گئی کہ کاٹو تو بدن میں لہو نہیں۔ وہ یہ سوچ کر چکرا گیا کہ ابھی ابھی اس نے جس آدمی کی پیٹھ پر کس کس کر

کوڑے مارے ہیں وہ کوئی معمولی سپاہی نہیں بلکہ راجا وکرم ہے۔ اب تو کسان بہت گھبرایا۔ اس کے ہاتھ سے کوڑا چھوٹ کر نیچے گر گیا۔ ڈر کے مارے وہ تھر تھر کانپنے لگا اور اک دم راجا کے قدموں پر گر پڑا۔

راجا نے اُسے اُٹھاتے ہوئے کہا "ڈرتے کیوں ہو؟ کوڑا اُٹھاؤ اور سزا پوری کرو۔"

کسان رونے لگا۔ اس کی گھگھی بندھ گئی۔ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر کہنے لگا "مہاراج مجھے معاف کر دو۔ انجانے میں میرے ہاتھوں سے بڑا پاپ ہو گیا ہے۔ یہ کہتے ہوئے وہ پھر سے راجا کے پیروں پر گرنے لگا۔

راجا چند قدم پیچھے ہٹ گیا۔ اس نے گرج کر کہا:۔ "اُٹھو، اور سزا کے باقی کوڑے پورے کرو۔ پہلے ہی کی طرح زور زور سے کوڑے لگاؤ۔ یاد رکھو، اگر تم نے جان بوجھ کر ایک بھی کوڑا دھیرے لگایا تو یہیں کھڑے کھڑے تمہاری کھال کھنچوا دوں گا اور تمہارے بیوی بچوں کو کولھو میں پلوا دوں گا۔"

کسان نے بے بسی سے راجا کی طرف دیکھا۔ راجا کڑک کر بولا:۔ "دیکھتے کیا ہو؟ کوڑا اُٹھاؤ اور سزا پوری کرو۔" وہ پیٹھ کھول کر پھر سے کسان کے سامنے آ کھڑا ہوا۔

کسان نے ڈرتے ڈرتے کوڑا اُٹھایا اور نہ چاہتے ہوئے راجا کو کوڑے مارنے لگا۔ باقی کے چار کوڑے اور مارنے کے بعد وہ پھر سے راجا کے پیروں پر گر پڑا اور گڑگڑا کر کہنے لگا:۔ "مہاراج، مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔"

راجا نے اُسے اُٹھا کر گلے سے لگالیا۔ اپنے ہاتھ سے اس کے آنسو پونچھے اور کہا ــــــ " اس میں معاف کرنے کی کیا بات ہے ؟ تم نے کہا نہ تھا کہ راجا وکرم کے راج میں سب کے لیے ایک ہی قانون ہے اور قانون کی نظروں میں سب برابر ہوتے ہیں۔ میں نے غلطی کی مجھے اپنی غلطی کی سزا ملی۔ اس میں تمہارا کیا قصور ؟ "

نمک کی کھیتی

کسی گاؤں میں ایک بوڑھا کسان رہتا تھا، اس کے دو بیٹے تھے۔ ان کے نام تو امیرالدین اور منیرالدین تھے لیکن سب لوگ انہیں امیرا، منیرا کے نام سے پکارتے تھے۔ دونوں بہت سست اور کام چور تھے۔ گاؤں بھر میں اُن سے زیادہ بے وقوف اور ضدّی کوئی نہ تھا۔ وہ اگر کسی بات پر اڑ جاتے تو پھر چاہے ادھر کی دنیا اُدھر ہوجائے وہ اپنی ضد چھوڑنے کو تیار نہ ہوتے۔

ایک مرتبہ بوڑھا کسان بہت بیمار ہوا، بے چارہ کھاٹ سے لگ گیا۔ گاؤں کے حکیم اور وید آئے۔ انہوں نے خوب علاج کیا، لیکن بوڑھے کی بیماری دن بہ دن بڑھتی ہی چلی گئی۔ جب جینے کی کوئی آس نہ رہی تو ایک دن اس نے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلایا اور کہنے لگا:

"میری آنکھ کے تارو! اب میں کوئی گھڑی پل کا مہمان ہوں۔ میری موت نظروں کے سامنے کھڑی ہے۔ قبر میرا انتظار کر رہی ہے لیکن دم ہے کہ نکلتا ہی نہیں، کیونکہ میرا جی تم دونوں میں اٹکا ہوا ہے کہ میرے مرجانے کے بعد تمہارا کیا ہوگا؟"
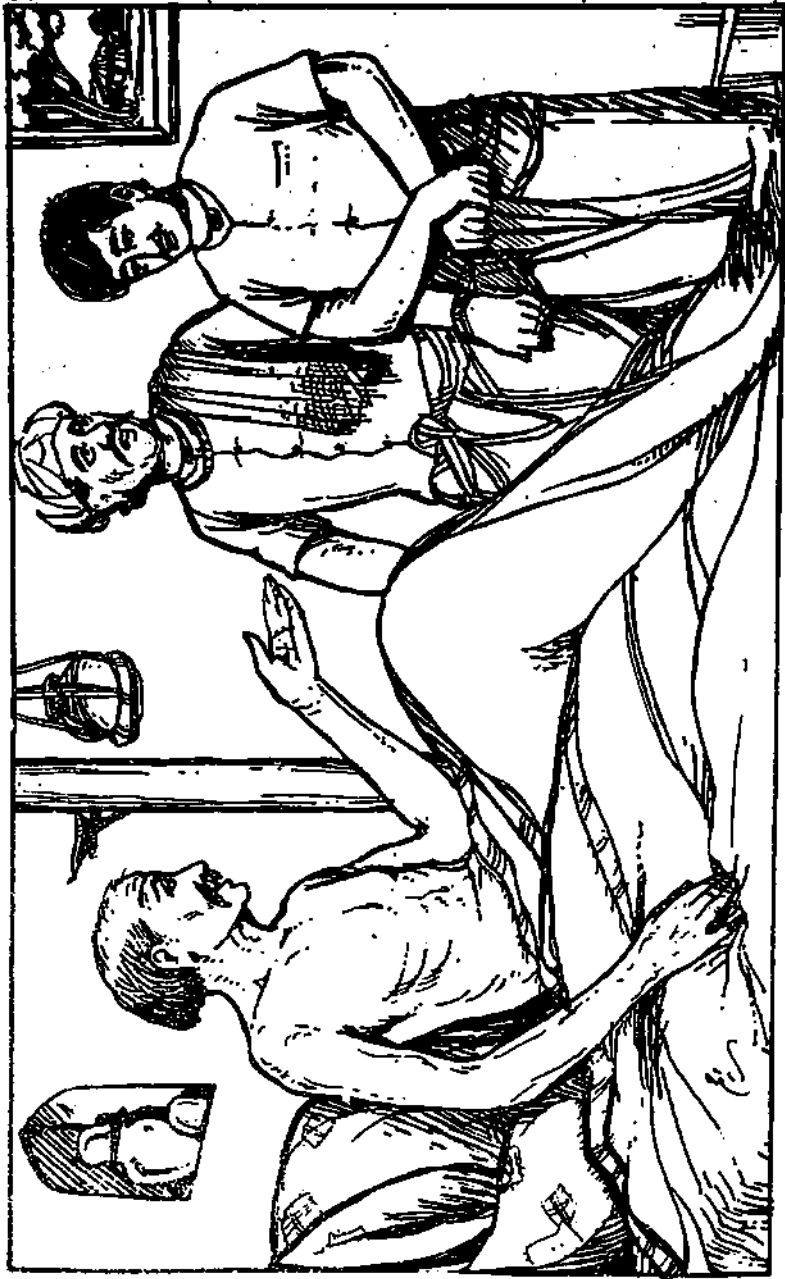
امیرا، منیرا باپ کے منہ سے ایسی بات سن کر رونے لگے۔
بوڑھے باپ نے انہیں دلاسا دیا: "رونے سے کچھ بھی نہ ہوگا۔ میرے بچو! تم مجھ سے وعدہ کرو کہ میرے بعد تم میرے نام کو بدنام نہ کروگے۔ بے وقوفی کی باتوں سے باز آؤگے۔ محنت کے کاموں میں خوب جی لگاؤگے کسی بات کے لیے ضد نہ کروگے۔ اپنی زمین پر کھیتی کر کے کماؤگے اور آج سے ذمے دار انسان بن جاؤگے۔"

دونوں بھائیوں نے باپ کی باتیں سن کر اس سے وعدہ کیا کہ وہ اس کی سمجھائی ہوئی ایک ایک بات پر عمل کریں گے۔

اپنے بے وقوف، اڑیل اور نکھٹو بیٹوں کی یہ بات سن کر بوڑھے کسان کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ اس نے اطمینان کی سانس لی۔ بیٹوں کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور پھر وہ مر گیا۔

باپ کی موت پر امیرا اور منیرا کے سر پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ وہ بہت روئے پیٹے۔ لوگوں نے اُن کی ڈھارس بندھائی، کہا: "دنیا میں یہی ہوتا آیا ہے۔ ہمیں بھی ایک دن مرنا ہے۔ اب اگر تم اپنے باپ کی روح کو سکون پہنچانا چاہتے ہو تو آج سے اپنی ساری بے وقوفیوں سے توبہ کر لو اور عہد کرو کہ تم نے اپنے باپ سے جو وعدہ کیا تھا اسے پورا کروگے۔"

امیرا اور منیرا نے سب کے سامنے عہد کیا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے وہ اپنے وعدے پر عمل کریں گے، اپنی زمین پر کھیتی کر کے کمائیں گے اور ذمے دار آدمی بن جائیں گے۔

باپ کا چالیسواں ہو جانے کے بعد ایک دن دونوں بھائیوں نے اپنے ہل بکھر سنبھالے، بیلوں کو کھولا اور کھیت کی طرف چل پڑے۔ اس دن سے ان کا

یہی معمول بن گیا۔ اتیرا اور تیرا روز سویرے منہ اندھیرے گھر سے نکل پڑتے۔ کھیت پر پہنچتے اور دن بھر سخت محنت کرتے۔ جب گاؤں کے لوگ انہیں کام کرتے ہوئے دیکھتے تو خوش ہوتے، وہ ایک دوسرے سے کہتے کہ اب اتیرا تیرا پہلے جیسے بے وقوف اور نکمے نہیں رہے۔ وہ تو بالکل بدل گئے ہیں۔

کچھ دنوں کے بعد اتیرا تیرا کا کھیت بوائی کے لیے تیار ہوگیا۔ اب انہیں اس بات کی فکر ہوئی کہ اس میں کیا بوئیں۔ دونوں نے سوچا، کھیت میں کوئی ایسی چیز بونا چاہیے جس کو دیکھ کر سب واہ واہ کریں۔ گیہوں، جوار، مکئی، باجرا وغیرہ تو سبھی بوتے ہیں اس لیے کوئی ایسی چیز بوئی جائے جو کسی دوسرے نے آج تک نہ بوئی ہو اور ہاٹ بازار میں جس کے دام بھی زیادہ ملیں۔

دونوں بھائی بہت دیر تک سوچتے رہے لیکن ان کی سمجھ میں کوئی چیز نہ آئی۔ آخر انہوں نے یہ طے کیا کہ بازار میں جو چیز سب سے زیادہ مہنگی بکتی ہو، ہم اپنے کھیت میں وہی چیز بوئیں گے۔

دونوں بھائی بنیئے کے پاس پہنچے اور اس سے پوچھا: "لالہ جی، آج کل بازار میں سب سے مہنگی چیز کون سی ہے؟"

بنیئے کو یہ تو معلوم تھا نہیں کہ یہ کس لیے پوچھ رہے ہیں اس نے فوراً جواب دیا: "نمک" کیونکہ اُن دنوں نمک بہت مہنگا تھا۔

اتیرا بولا: "لالہ جی، اگر ہم تمہیں نمک بیچیں گے تو کیا تم خرید لوگے؟"

بنیئے نے کہا: "ہاں ہاں، کیوں نہیں؟ ضرور خرید لیں گے۔"

تیرا بولا: "کتنا نمک خریدو گے، ہم تو بہت سارا نمک بیچنا چاہتے ہیں۔"

بنیئے نے خوش ہوکر کہا: "تمہارے پاس جتنا نمک بھی ہو سب لے آؤ، میں سارے کا سارا خرید لوں گا۔"

امیرا بولا :- "لالاجی، ہم تم سے پہلے کہے دیتے ہیں کہ اُدھار نہیں دیں گے۔"
بنیے نے کہا :- "میں اُدھار کب مانگ رہا ہوں، تم لاؤ تو سہی میں نقد خریدوں گا۔"

امیرا منیرا دونوں نے ایک ساتھ کہا :- "تو لالاجی ہم سودا پکا سمجھیں!"
بنیا بولا :- "بالکل پکا سمجھو جی۔"

امیرا اور منیرا اپنے گھر آگئے۔ ان کے گھر میں نمک کے دو بڑے مٹکے بھرے رکھے تھے، دونوں بھائیوں نے وہی نمک لے جاکر اپنے کھیت میں بو دیا۔

کچھ دنوں بعد بارش کا موسم آیا۔ خوب موسلا دھار پانی برسا۔ امیرا منیرا کا کھیت جل تھل ہوگیا۔ چند دنوں کے بعد کھیت میں برساتی گھاس اُگ آئی دونوں بھائیوں نے جب یہ دیکھا تو بہت خوش ہوئے، کہنے لگے :- "ہم پر خدا مہربان ہے۔ دیکھو سارے کھیت میں نمک کے پودے کیسے سر اُٹھائے زمین سے جھانک رہے ہیں۔ جب نمک کی فصل آئے گی تو گاؤں والے اسے دیکھ کر حیران رہ جائیں گے جو لوگ ہمیں بے وقوف اور نکھٹو سمجھتے تھے ان کے مُنہ بند ہوجائیں گے۔ ہم نے اپنے کھیت میں سب سے مہنگی چیز بوئی ہے۔ پہلی ہی فصل پکنے کے بعد ہم گاؤں کے دولت مند کسان کہلانے لگیں گے۔ سب لوگ ہماری بھی عزّت کریں گے۔ ہمیں سلام کیا کریں گے۔

دو تین ہفتوں میں گھاس کچھ بڑی ہو گئی، ایک دن صبح کے وقت جب امیرا منیرا اپنے کھیت پر پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ کھیت میں ہری ہری گھاس پر ننھی ننھی سفید سفید بوندیں چمک رہی تھیں۔ یہ اوس کی بوندیں تھیں دونوں نے پہلے کبھی کھیت پر کام کیا ہوتا تو اوس کو سمجھتے! کھیت میں ہری ہری گھاس پر اوس کی سفید سفید بوندیں دیکھ کر وہ یہی سمجھے کہ نمک کے

پودوں پر نمک لگنا شروع ہوگیا ہے۔اب تو وہ مارے خوشی کے پھولے نہ سمائے۔

کئی دنوں تک یہی ہوتا رہا۔وہ روزانہ سویرے سویرے کھیت پر جاتے، وہاں انہیں گھاس پر اوس کی بوندیں نظر آتیں۔سورج کی کرنیں پڑنے سے یہ بوندیں خوب چمکتیں اور اتیرا گھیرا اوس کی ان سفید سفید بوندوں کو نمک سمجھ کر خوب خوش ہوتے۔

یہ تو سب جانتے ہیں کہ جیسے جیسے دن چڑھتا جاتا ہے۔ سورج کی گرمی بڑھتی جاتی ہے اور اوس کی بوندیں خشک ہوجاتی ہیں لیکن اتیرا گھیرا ٹھہرے بے وقوف وہ اس بات کو کیا جانیں؟ ایک دن دوپہر کو دونوں بھائی کھیت پر گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ پودوں پر نمک کا نام ونشان تک نہیں ہے، اب تو وہ بہت سٹپٹائے، سمجھے کہ ہو نہ ہو سارا نمک چور توڑ لے گئے ہیں۔ اس لیے کہ صبح کو تو خود انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا کہ تمام پودوں پر نمک کی چھوٹی چھوٹی ڈلیاں لگ رہی تھیں۔

دونوں بھائیوں نے طے کیا کہ کل سے وہ اپنی کھیتی کی حفاظت کے لیے دن بھر کھیت پر پہرہ دیا کریں گے، دوسرے دن صبح سویرے وہ اپنے کھیت پر پہرہ دینے کے لیے گھر سے نکل پڑے۔یہ سوچ کر کہ کہیں چور ڈاکوؤں سے مقابلہ نہ کرنا پڑے، انہوں نے کمر میں تلواریں بھی باندھ لیں۔

جب دونوں بھائی کھیت پر پہنچے تو روز کی طرح گھاس پر اوس کی بوندیں چمک رہی تھیں۔ انہوں نے کہا: "دیکھو، اتنی نمک روز ہی لگتی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اتنے دن سے روز ہمارے کھیت میں سے چوری ہورہی ہے اور ہمیں اب معلوم ہوا۔ خیر اب ہم چوروں کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ آج انہیں

چوری کا مزا چکھا کر رہیں گے۔"

دونوں اپنی اپنی تلواریں سونت کر کھیت میں پہرہ دینے لگے۔ کبھی اِدھر سے اُدھر جاتے، کبھی اُدھر سے اِدھر ـــــ اسی طرح دو پہر ہو گئی۔ جب وہ کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو نمک کی ضرورت ہوئی۔ امیرا نے نمک توڑنے کے ارادے سے جو پودوں پر نظر ڈالی تو وہاں نمک کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ دونوں بھائی حیران رہ گئے کہ صبح تو پودوں پر نمک لگا ہوا تھا، اس وقت سے وہ تلواریں سونت کر کھیت پر پہرہ دے رہے ہیں۔ کھیت پر کوئی آیا نہیں۔ پھر نمک کیسے چوری ہوا۔ کیا اسے آسمان نگل گیا یا زمین کھا گئی؟

دونوں بھائیوں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑ رہی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ ان کے اتنے کڑے پہرے کے باوجود نمک کون چُرا لے گیا۔ اتنے میں انہوں نے کھیت میں ٹڈوں کو پھُدکتے ہوئے دیکھا۔ سارے کھیت میں ہرے ہرے ٹڈے پھُدک رہے تھے۔ دونوں نے کہا، ہو نہ ہو یہی ٹڈے ان کا سارا نمک چُرا کر کھا جاتے ہیں۔ ان بدمعاشوں کو چوری کرنے کا مزا چکھانا چاہیے۔ یہ کہہ کر دونوں نے اپنی تلواریں سونت لیں اور ٹڈوں پر ٹوٹ پڑے۔ ٹڈے کبھی اِدھر سے اُڑ کر اُدھر جاتے، کبھی اُدھر سے اِدھر۔ دونوں بھائی دیوانوں کی طرح ان کے پیچھے تلوار لیے دوڑتے۔ پینترے بدل بدل کر انہیں مارنے کی کوشش کرتے۔

ذرا سی دیر میں سارے گاؤں کے لوگ ان کے کھیت پر جمع ہو گئے۔ دونوں بھائیوں کو اپنے کھیت میں پینترے بدل بدل کر تلوار چلاتے ہوئے دیکھ دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔ اسی دن سے گاؤں والوں میں "نمک کی کھیتی کرنا" والی مثل بن گئی۔ جب کوئی بے وقوفی کا کام کرتا تو گاؤں والے کہتے،" تم تو نمک کی کھیتی کرتے ہو۔"

بے ایمان راجا

کسی گاؤں میں ایک پنڈت جی رہتے تھے۔ دھرم کرم اور علم کی باتیں تو وہ خوب جانتے تھے لیکن بیچارے بہت غریب تھے۔ گاؤں کے لوگ ٹھہرے نپٹ جاہل، وہ علم ہی کی قدر کرنا نہیں جانتے تھے تو پنڈت جی کی قدر کیا کرتے؟ ایک وقت ایسا آیا کہ پنڈت جی بھوکوں مرنے لگے۔

پنڈت جی کو کوئی کام وام تو آتا نہیں تھا۔ ان کے لیے اپنا اور اپنے گھر والوں کا پیٹ بھرنا مشکل ہوگیا۔ اب کریں تو کیا؟ ڈھور ڈنگر ہانکنے سے تو رہے، ناچار بھیک مانگنے لگے۔ وہ روز صبح سویرے منہ اندھیرے اُٹھ جاتے۔ پہلے پُوجا پاٹ کرتے، پھر کاسہ ہاتھ میں لے کر بھیک مانگنے نکل پڑتے۔ گاؤں بھر میں دروازے دروازے آواز لگاتے۔ بھیک میں جو کچھ پاتے، گھر لے آتے اور پھر گھر کے سب لوگ مل بیٹھ کر کھاتے۔ جس دن کچھ نہیں ملتا، سب بھوکے سو رہتے۔ اسی طرح ان کی زندگی کے دن گزر رہے تھے۔

ایک دن پنڈت جی کی بیوی نے ان سے کہا: "گاؤں کے لوگ علم کی قدر نہیں جانتے۔ ہماری حالت تو پہلے بھی خراب تھی۔ اب دن بہ دن اور زیادہ خراب ہوتی جا رہی ہے۔ تھوڑے دنوں بعد لوگ بھیک دینا بھی چھوڑ دیں گے

تو ہم سب بھوکوں مر جائیں گے۔ دیکھتے نہیں گھر میں جوان بیٹی بیٹھی ہے۔ اس کی شادی الگ کرنی ہے۔ اگر نہیں کریں گے تو لوگ ـــــ نام دھریں گے گھر میں پھوٹی کوڑی نہیں۔ لڑکی کی شادی کیسے کروگے ؟ اگر میری مانو تو کتھا بانچنا شروع کردو۔ اس طرح دو چار پیسے ملیں گے۔ تب ہی ہم کچھ کرسکیں گے۔

بیوی کی بات سُن کر پنڈت جی کا دل بھر آیا۔ انہوں نے بڑے دُکھ بھرے انداز میں جواب دیا ـــــ "تم بات تو ٹھیک کہہ رہی ہو، لیکن آج کل کے لوگ بے دھرم ہوگئے ہیں۔ پیسے کوڑی دینے کی بات تو دور رہی۔ وہ کتھا سُننا ہی پسند نہیں کرتے۔"

پنڈت جی کا یہ جواب ان کی بیوی کو بہت بُرا لگا۔ وہ چڑ کر بولی :۔ "گاؤں والوں کو کیوں نام دھرتے ہو۔ اصلی بے دھرم تو تم خود ہو، جوان بیٹی کو گھر میں بٹھا رکھا ہے۔ اس کی شادی کی کچھ فکر کروگے یا نہیں ؟"

بیوی کی کڑوی بات سُن کر پنڈت جی کو بہت غصہ آیا۔ دُکھ بھی ہوا۔ لیکن بے چارے کر بھی کیا سکتے تھے ؟ بیوی نے جو بات کہی تھی وہ بھی اپنی جگہ پر ٹھیک ہی تو تھی !

پنڈت جی نے بیوی کو تو کچھ جواب نہ دیا لیکن آؤ دیکھا نہ تاؤ، اپنی پوتھی پتری اُٹھائی اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

وہ اپنی پوتھی پتری بغل میں دبائے، بہت دنوں تک اِدھر اُدھر بھٹکتے پھرے۔ ایک گاؤں سے دوسرے گاؤں، دوسرے سے تیسرے گاؤں اسی طرح گاؤں گاؤں گھومتے اور لوگوں سے پوچھتے پھرتے لیکن کوئی بھی اُن سے کتھا کروانے کے لیے تیار نہ ہوا۔

پنڈت جی اتنی کوشش کرنے کے بعد بھی کچھ حاصل نہ کرسکے۔ اور ہر طرف سے مایوس ہوگئے۔ آخر ایک دن وہ ایک گھنے جنگل میں گئے اور آسمان کی طرف ہاتھ اُٹھا کے دھاڑیں مار مار کر رونے لگے، کہنے لگے ـــــ اُے بھگوان، اب اور نہیں سہا جاتا۔ تم یا تو مجھے خوب دھن دولت دے دو یا پھر میری جان ہی لے لو۔ ایسے جینے سے کیا حاصل؟ نہ پیٹ کو روٹی نہ تن کو کپڑا۔ اس پر ستم یہ کہ جوان بیٹی گھر میں بیٹھی ہے۔ اس کا باپ لگ رہا ہے وہ الگ۔ میرا جینا بھی کوئی جینا ہے۔؟

یکایک پاس کی جھاڑیوں میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی۔ پنڈت جی مارے ڈر کے کانپنے لگے۔ ان کی گھگھی بندھ گئی۔ کہیں شیر یا چیتا تو نہیں آگیا! لیکن جھاڑیوں میں سے ایک ایک کرکے چار سیار برآمد ہوئے ـــــ وہ چاروں پنڈت جی کے سامنے آکر کھڑے ہو گئے۔ پنڈت جی گھبرا گئے۔ کون جانے یہ سیار کیا کرنا چاہتے ہیں۔

ایک سیار نے پنڈت جی سے کہا ـــــ " ڈرو نہیں، تمہاری بپتا سن کر ہمیں بہت افسوس ہوا۔ اسی لیے ہم سب تمہاری مدد کرنے آئے ہیں۔ گھبراؤ نہیں۔ ہم تمہیں ایک بکری دیتے ہیں۔ اسے گھر لے جاؤ۔ مالک پر بھروسہ رکھو۔ اس کی کرپا سے بہت جلد تمہارے دن پھر جائیں گے۔ سارے دُکھ درد دُور ہو جائیں گے "

یہ کہہ کر چاروں سیار پھر سے جھاڑیوں میں گھس گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک چھوٹی سی بکری لے کر لوٹ آئے۔ بکری بہت خوبصورت تھی۔ سیاروں نے وہ بکری پنڈت جی کو دے دی اور کہنے لگے ـــــ " یہ جادُو کی بکری ہے۔ ہر روز صبح جب تم اس کا دودھ دو ہوگے تو یہ تین

سیر دودھ اور ایک تولہ سونا دیا کرے گی۔"

"کیا سچ سچ ایسا ہی ہوگا ؟" پنڈت جی نے بکری لینے کے لیے آگے بڑھتے ہوئے پوچھا۔

"ہاں، ایسا ہی ہوگا۔ لیکن ہماری دو باتیں یاد رکھنا۔"

"وہ کیا باتیں ہیں ؟" پنڈت جی نے بے صبری سے پوچھا۔ سیار بولے: "پہلی بات تو یہ ہے کہ اس بکری کا دودھ ہرگز نہ بیچنا۔ دوسری یہ کہ بکری کے سونا دینے کا راز کسی پر ظاہر نہ کرنا۔ اگر تم یہ دونوں باتیں پوری کرنے کا وعدہ کرتے ہو تو بکری لے جاؤ۔"

پنڈت جی نے چاروں سیاروں سے وعدہ کیا اور بکری لے کر اپنے گھر آگئے۔ دوسرے روز صبح جب بکری کا دودھ دوہتے تو بکری تین سیر دودھ تو دیتی اور ایک تولہ سونا بھی دیتی۔ پنڈت جی تھوڑے ہی دنوں میں بہت امیر ہوگئے۔ انہوں نے اپنی کٹیا کی جگہ ایک بہت بڑا محل بنوالیا اور بہت بڑی دھوم دھام سے اپنی بیٹی کی شادی بھی کردی۔

لوگوں کو ان کی اس کایا پلٹ پر بڑی حیرت ہوئی۔ جب لوگ ان سے پوچھتے کہ تم کل تک تو در در جاکر بھیک مانگا کرتے تھے۔ اب تمہارے پاس اتنی دولت کہاں سے آگئی ؟ پنڈت جی فخر سے کہتے کہ میں دوسرے دیس سے کماکر لایا ہوں۔ لیکن لوگوں کو ان باتوں پر یقین نہ آتا۔ کوئی کہتا پنڈت جی نے کہیں ڈاکہ مارا ہے۔ کوئی کہتا، انہیں زمین میں گڑا ہوا دھن مل گیا ہے۔ کوئی کہتا ان کے بس میں ایک دیو ہے جو ان کی ہر خواہش پوری کردیتا ہے۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔

یہ باتیں اڑتے اڑتے راجا تک پہنچیں۔ اس نے اپنے سب سے ہوشیار

جاسوس کو بلایا اور کہا :۔" تم کسی بھی طرح یہ معلوم کرو کہ پنڈت کے پاس یہ دھن کہاں سے آتا ہے۔ اگر تم اصل بات کا پتہ لگاؤ گے تو منہ مانگا انعام پاؤگے"

راجا کا جاسوس ایک نوکر کا بھیس بدل کر پنڈت جی کے محل میں کام کرنے لگا۔ وہ ہمیشہ پنڈت جی کی ٹوہ میں لگا رہتا اور ان کی ہر ایک حرکت پر کڑی نظر رکھتا۔ ایک دن اس نے چھپ کر دیکھا کہ برہمن بکری کے تھنوں سے سونا دوہ رہا ہے۔ وہ دوڑا دوڑا الراج محل میں گیا اور اس نے راجا کو ساری بات کہہ سُنائی۔

بکری کے سونا دینے کی خبر سُن کر راجا حیرت میں پڑ گیا لیکن خوشی سے اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ اس کے دل میں بھی لالچ آگیا۔ دوسرے دن اس نے پنڈت جی کو اپنے دربار میں طلب کیا اور کہا :۔" ہم نے سُنا ہے تمہارے پاس بہت خوب صورت بکری ہے، وہ بکری ہمیں دے دو۔ راج کمار بکری کے ساتھ کھیلنے کی ضد کر رہا ہے۔"

پنڈت جی بولے :۔" مہاراج کا حکم سر آنکھوں پر، میں راج کمار کے لیے ایک کیا، دس بکریاں بھجوا دوں گا۔

راجا نے کہا :۔ " نہیں، ہمیں تو راج کمار کے لیے صرف وہی بکری چاہیے جو تمہارے گھر میں بندھی ہوئی ہے۔"

پنڈت جی بولے :۔" مہاراج وہ تو بہت معمولی بکری ہے میں راج کمار کے لیے اچھی اچھی بکریاں لا دوں گا۔"

"تمہاری یہ مجال کہ ایک معمولی بکری کے لیے راجا کی بات کو ٹھکرا رہے ہو۔" راجا غصّے میں کڑک کر بولا۔

راجا کو غصّے میں دیکھ کر پنڈت جی کے پسینے چھوٹ گئے لیکن انہوں نے

خود کو سنبھالتے ہوئے بڑے ادب کے ساتھ کہا ـــــ "مہاراج اس کے پیچھے ایک راز ہے"

"ایسا کیا راز ہے؟ ذرا ہم بھی تو سُنیں۔" راجا نے پوچھا۔

پنڈت جی بولے :۔ "مہاراج پہلے جب میں بہت غریب تھا اور در بہ در بھیک مانگا کرتا تھا اس وقت یہ بکری مجھے بھیک میں ملی تھی۔ اب آپ خود سوچیے کہ میں بھیک میں ملی ہوئی چیز بھلا آپ کو کیسے دے سکتا ہوں؟۔"

پنڈت جی اپنی ہوشیاری پر دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ انہوں نے ایسی بات کہہ دی ہے جسے سُن کر راجا لا جواب ہو جائے گا اور بکری نہ لے گا۔ لیکن راجا بھی بہت چالاک تھا۔ وہ بھلا کب ہار ماننے والا تھا۔ اس نے کہا ـــــ ٹھیک ہے، تم ہمیں بکری نہیں دے سکتے، لیکن اس کا دُودھ تو بیچ سکتے ہو۔ کل سے ہم اس بکری کا دُودھ مت دوہنا ہمارا نوکر آ کر دودھ لیا کرے گا اور اس کی جو بھی قیمت ہوگی تمہیں دے دیا کرے گا۔"

پنڈت جی کے منہ پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، بولے :۔ "مہاراج سو تو ٹھیک ہے لیکن میں اس بکری کا دُودھ بیچ نہیں سکتا۔ اگر آپ کو دُودھ کی ضرورت ہے تو دس گھڑے دُودھ روز بھجوا دیا کروں گا۔"

پنڈت جی کی یہ بات سُن کر راجا آگ بگولہ ہو گیا۔ گرج کر بولا ـــــ "کم بخت، کیا ہمیں بھکاری سمجھا ہے جو دس گھڑے دُودھ مُفت بھجوائے گا!"

اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ پنڈت کے گھر جاؤ اور اس کی بکری اُٹھا لاؤ۔ سپاہی اسی وقت گئے اور آن کی آن میں پنڈت جی کے گھر سے ان

کی بکری لے کر آگئے۔

پنڈت جی بہت گڑگڑائے، انہوں نے بہت داد فریاد کی، روئے پیٹے بھی۔ لیکن راجا نے ان کی ایک نہ سُنی بلکہ دھکّے مار کر اپنے محل سے نکلوا دیا۔

پنڈت کو بکری کے اس طرح چھن جانے کا بہت دُکھ ہوا۔ دوسرے دن وہ پھر اسی جنگل میں پہنچے جہاں انہیں چار سیار ملے تھے اور انہوں نے بکری لا کر دی تھی ـــــ جنگل میں پہنچ کر پنڈت جی زور زور سے رونے اور چلّانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد قریب کی جھاڑیوں میں کھڑکھڑاہٹ ہوئی اور ایک ایک کر کے چاروں سیار جھاڑیوں میں سے نکل کر اُن کے سامنے آگئے اور پنڈت جی سے ان کے رونے کا سبب پوچھنے لگے۔ پنڈت جی نے رو رو کر سارا قصّہ سُنایا کہ راجا نے کس طرح اُن کی بکری چھین لی ہے۔

سیاروں نے کہا، "تم کوئی فکر نہ کرو۔ وہ بکری جتنا سونا دے سکتی تھی، وہ تمہارے گھر میں دے چکی ہے۔ ہم ایک ایسا منتر پڑھ کر پھونک دیں گے کہ وہ بکری بالکل معمولی بکری بن جائے گی اور جب راجا اسے دوہے گا تو وہ سونا نہیں دے گی بلکہ صرف دُودھ دے گی اور وہ بھی تین سیر نہیں بلکہ پاؤ بھر۔ اب تمہاری تمام ضرورتیں بھی پوری ہو چکی ہیں۔ اس لیے بکری کا خیال اپنے دل سے نکال دو اور مالک کا نام لے کر باقی تمام عمر آرام سے گزارو۔"

پنڈت جی نے کہا ـــــ "واہ، یہ بھی خوب کہی! ایک تو راجا نے زبردستی بکری چھین کر مجھ پر اتنا بڑا ظلم کیا ہے۔ میرے ساتھ بے انصافی کی ہے اور تم اُلٹے مجھی کو چُپ بیٹھ رہنے کے لیے کہہ رہے ہو۔ دراصل تم اس بُرے

وقت میں میرا ساتھ نہیں دینا چاہتے۔ تمہیں معلوم نہیں کہ مجھے اس بکری سے کتنا پریم ہے۔ میں اسے اپنی اولاد سے بڑھ کر چاہتا ہوں، اسی لیے اس کی جدائی برداشت نہیں کرسکتا۔ اگر تم لوگوں نے اس موقع پر میرا ساتھ نہیں دیا اور بکری کے معاملے میں میرے ساتھ انصاف نہیں کرایا تو میں اسی وقت اپنی جان دے دوں گا۔ یادرکھو، تمہیں اور اس پورے جنگل کو ایک دُکھی برہمن کی موت کا پاپ لگے گا۔"

سیاروں نے کہا:" ہم خوب جانتے ہیں کہ تمہیں اس بکری سے کتنا پریم ہے اور سونے سے کتنا؟ اصل میں تم لالچی آدمی ہو لیکن ہمارے سامنے پریم اور انصاف کا ڈھونگ کر رہے ہو۔ پھر بھی ہم اپنے جنگل کو کسی برہمن کی موت کا پاپ نہیں لگنے دیں گے۔ جاؤ، اور اپنے راجا سے کہو کہ وہ پنچایت بٹھائے، بکری کس کی ہے؟۔ اس بات کا فیصلہ پنچ کریں گے۔"

"لیکن اس سے کیا ہوگا؟ پنچایت میں جو لوگ بیٹھیں گے وہ سب راجا ہی کی طرف داری کریں گے۔ مجھ غریب کو کون پوچھے گا؟ میرے ساتھ انصاف کون کرے گا؟" پنڈت جی نے فکرمند ہوکر پوچھا۔

سیاروں نے کہا ـــــــ " تم اس کی فکر مت کرو۔ تمہاری طرف سے ہم پنچ بنیں گے اور تمہارے ساتھ پورا پورا انصاف کرائیں گے۔"

پنڈت جی، سیاروں سے وعدہ کرکے اپنے گھر لوٹ آئے۔ دوسرے دن وہ راج محل پہنچے اور راجا سے بولے کہ "بکری کے معاملے میں میرے ساتھ ناانصافی ہوئی ہے۔ اس لیے پنچایت بٹھائی جائے۔" راجا پنچایت بٹھانے کے لیے راضی ہوگیا۔

یہ سُن کر پنڈت جی دوڑے دوڑے جنگل میں گئے۔ سیاروں سے کہنے لگے :۔ "راجا پنچایت بٹھانے کے لیے تیار ہے۔ چلو، اب میرے ساتھ انصاف کراؤ۔ میری بکری مجھے دلاؤ۔"

سیار اُن کے ساتھ چلنے کے لیے راضی ہوگئے۔ لیکن اُنہیں راستے میں کُتّوں کا ڈر تھا۔ اس لیے اُنہوں نے پنڈت جی سے کہا کہ تم ہم چاروں کو ایک پوٹلی میں باندھ لو اور اپنے کندھے پر لاد کر راج محل تک لے چلو۔

پنڈت جی کی تیوری پر بل آ گیا۔ بولے ــــــ "کہیں تم لوگ میرے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہے ہو؟ پہلی بات تو یہ کہ تم چاروں ایک ہی پوٹلی میں نہیں آ سکتے۔ دوسری یہ کہ میں بوڑھا اور کمزور آدمی ہوں۔ تم چاروں کو اپنے کندھے پر لاد کر راجا کے دربار تک کیسے جاؤں گا؟"

سیار بولے :۔ "تم اس کی فکر نہ کرو۔ ہم چاروں چھوٹے اور ہلکے ہو جائیں گے۔ پھر تمہاری پوٹلی میں بھی آسانی سے آ جائیں گے اور تم پر زیادہ بوجھ بھی نہیں پڑے گا۔"

یہ کہہ کر چاروں سیار دیکھتے ہی دیکھتے اتنے چھوٹے اور ہلکے پھلکے ہو گئے جیسے کہ وہ روئی کے کھلونے ہوں۔ اب پنڈت جی نے اُنہیں ایک پوٹلی میں باندھ لیا اور اپنے کندھے پر رکھ کر راج دربار کی طرف چل پڑے۔

جب پنچایت شروع ہوئی تو سب نے پنڈت جی سے پوچھا :۔ "تمہارے پنچ کہاں ہیں؟" پنڈت جی نے سب کے سامنے اپنی پوٹلی کھول دی۔ اس میں سے چار بڑے بڑے سیار نکلے اور وہ پنچوں کی جگہ پر بیٹھ گئے۔ اُنہیں دیکھ کر سب حیران رہ گئے کہ یہ کیسے پنچ ہیں۔

پنچوں نے پوچھا ــــــ "پنڈت، بولو تمہیں راجا سے کیا شکایت ہے؟"

پنڈت جی ہاتھ جوڑ کر کہنے لگے :-

"مجھے ان سے کیا شکایت ہوسکتی ہے ؟ یہ ٹھہرے مہاراج ادھیراج اور میں ایک غریب برہمن ۔ وہ راجا ہیں ، مَیں ان کی پرجا۔ بھلا مجھے ان سے کیا شکایت ہوسکتی ہے ؟"

"تو پھر تم نے پنچایت کس لیے بلوائی ہے ؟" ایک پنچ نے غصّے میں پوچھا۔

"مجھے تو آپ پنچوں سے ایک بنتی کرنا تھی۔ راجا کے سپاہیوں نے میری بکری چھین لی ہے۔ وہ اسے راج محل میں لے گئے ہیں۔ مجھے میری بکری واپس دلائی جائے۔"

پنچوں نے راجا سے پوچھا :- "اس کے بارے میں آپ کو کچھ کہنا ہے ؟"

راجا نے جواب دیا ــــ "ہاں ، ہمیں ایک ہی بات کہنا ہے ، وہ یہ کہ اپنے راج کی ہر چیز پر راجا کا بھی حق ہوا کرتا ہے۔ یہ رواج صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اگر میرے سپاہی راج کُمار کے کھیلنے کے لیے اس کی بکری لے آئے تو اس میں کون سی بُری بات ہے ؟ میں اس بکری کی قیمت دینے کے لیے تیار ہوں بلکہ پنڈت جی کو بکری کی قیمت کے علاوہ ایک سو بکریاں اور بھی دے سکتا ہوں۔"

راجا کی یہ بات سُن کر ایک سیار نے اُوپر آسمان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ وہ ٹکٹکی باندھے آسمان پر نظریں جما کر بیٹھ گیا ــــ دوسرے سیار نے اپنی گردن جھکالی اور غور سے زمین کی طرف دیکھنے لگا۔ تیسرے سیار نے راجا کی طرف سے آنکھیں پھیر لیں اور اُس کی طرف پیٹھ پھیر کر بیٹھ گیا ــــ چوتھا سیار راجا کے بالکل سامنے آکر کھڑا ہوگیا اور اس نے راجا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

سب لوگ حیران ہوکر کبھی پنڈت جی کی طرف دیکھتے تھے اور کبھی ان چاروں سیاروں کی طرف۔ لیکن راجا بہت چالاک تھا۔ اس نے اونچی آواز میں پنڈت جی سے کہا ــــ "دیکھو یا پنڈت، تمہارے پنچ ہمارا فیصلہ سن کر بغلیں جھانک رہے ہیں۔ اب تو ہماری بات مان جاؤ۔ دیکھو ضد نہ کرو بکری کی قیمت دینے کے لیۓ ہم تیار ہیں۔ چاہو تو اسی وقت لے لو ــ اور فیصلہ کردو۔"

پنڈت جی ابھی کچھ کہنے بھی نہ پائے تھے کہ آسمان کی طرف دیکھنے والے سیار نے زور سے غصے کی آواز نکالی۔

راجا نے اس سے پوچھا:۔" اس طرح کی آواز نکالنے کا کیا مطلب؟ اور تم فیصلہ ماننے کی بجائے اونٹ کی طرح منہ اٹھا کر آسمان کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

سیار نے کہا ــــ" بڑے بوڑھوں سے سنتے آئے ہیں کہ جب کبھی انصاف کرنے والے ہی ناانصافی پر اتر آتے ہیں تو انصاف کرنے کے لیۓ آسمان سے دیوتا خود دوڑے چلے آتے ہیں۔ میں ان ہی کا رستہ دیکھ رہا ہوں۔"

راجا نے دوسرے سیار سے، جو گردن جھکائے زمین کی طرف دیکھے جارہا تھا، پوچھا ــــ" تم زمین کی طرف کیا دیکھ رہے ہو؟"

سیار نے اسی طرح گردن جھکاتے ہوئے جواب دیا:۔" ہم اپنے بڑوں سے سنتے آئے ہیں کہ جب کوئی راجا اپنی پرجا کے ساتھ بے انصافی کرتا ہے تو زمین پھٹ جاتی ہے۔ اسی لیے میں زمین کی طرف دیکھ رہا ہوں۔"

راجا نے تیسرے سیار سے پوچھا:۔" تم میری طرف پیٹھ کرکے کیوں بیٹھ

گئے ہو؟

تیسرے سیار نے رُوکھے پن سے جواب دیا: "مجھے بے انصاف لوگوں سے سخت نفرت ہے۔ ایسے لوگوں کی صورت دیکھنا بھی پسند نہیں۔ اس لیے تمہاری طرف پیٹھ کیے بیٹھا ہوں۔"

آخر میں راجا نے چوتھے سیار سے سوال کیا: "اور تم میری طرف ٹکٹکی باندھے کیا دیکھ رہے ہو؟"

"میں دیکھ رہا ہوں کہ تم اس پنڈت کے ساتھ بے انصافی کرتے ہوئے مجھ سے آنکھ ملا سکتے ہو یا نہیں؟ سُنا ہے آنکھ میں شرم ہوتی ہے۔"

چاروں سیاروں کے جواب سُن کر راجا چپ ہو گیا۔ وہ تھوڑی دیر تک اسی طرح بیٹھا ہوا کچھ سوچتا رہا۔ یکایک اس کی آنکھیں چمک اُٹھیں۔ چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ مسکرایا اور سب کو مخاطب کر کے اونچی آواز میں کہنے لگا ——— "لوگو! برہمن کے بنائے ہوئے پتلوں کی باتیں آپ سُن ہی چکے ہیں۔ انہوں نے جو کچھ کہا ہے وہ بالکل سچ ہے۔ میں سچی بات کے آگے ہمیشہ سر جھکاتا آیا ہوں۔ اس لیے اس سچ کو بھی تسلیم کرتا ہوں۔ اس کے مطابق فیصلہ میرے حق میں رہا۔"

"وہ کیسے؟" ایک ساتھ کئی آوازیں سُنائی دیں۔

راجا نے مُسکرا کر کہنا شروع کیا: "جب انصاف کرنے والے بے انصافی کرتے ہیں تو دیوتا دوڑے چلے آتے ہیں۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ دیوتا نہیں آئے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انصاف کرنے والوں نے پنڈت کے ساتھ انصاف کیا ہے۔

ایسا بھی کہا جاتا ہے کہ جب کوئی راجا کسی کے ساتھ بے انصافی کرتا ہے

تو زمین پھٹ جاتی ہے لیکن آپ سب دیکھ رہے ہیں کہ زمین بالکل نہیں پھٹی۔ مطلب یہ ہے کہ پنڈت کو بکری کی قیمت قبول کر لینا چاہیے۔ انصاف کی بات یہی ہے اسی لیے میں چوتھے سیار سے آنکھیں نہیں چرا رہا ہوں بلکہ اس سے آنکھ ملا کر بات کر رہا ہوں۔"

تیسرا سیار ابھی تک راجا کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا تھا۔ یہ بات سن کر وہ اچانک غصّے میں راجا کی طرف مڑا۔ اس کے مڑتے ہی راجا نے سب سے کہا "یہ دیکھو، بے انصافوں کی صورت سے نفرت کرنے اور ان کی صورت نہ دیکھنے والا بھی میری طرف دیکھ رہا ہے۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ میں نے پنڈت جی کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا ہے۔"

راجا کے منہ سے ایسی مکّارانہ باتیں سن کر چاروں سیار ہکّا بکّا رہ گئے اور پھر وہ چاروں دُم دبا کر وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔

راجا بڑی شان سے مسکراتا ہوا اپنے محل کے اندر چلا گیا اور بے چارہ پنڈت کھڑا روتا رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد جب پنچایت اُٹھ گئی اور سب لوگ ایک ایک کر کے وہاں سے جانے لگے تو ایک بوڑھا آدمی پنڈت جی کے پاس آیا اور بڑی ہمدردی کے ساتھ ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا :- "کیا کریں بھائی، اب وقت بدل گیا ہے، بدلتے ہوئے وقت میں کوئی کسی کا ساتھ نہیں دے سکتا۔"

بے وقوف کہیں کے

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ راجا بھوج کچھ پریشان تھے۔ پریشانی کی کوئی خاص وجہ نہیں تھی۔ بس یوں ہی پریشان تھے۔ ان کا کسی بھی کام میں دل نہیں لگ رہا تھا۔ طبیعت بے چین تھی۔ اُن کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کریں کیا نہ کریں؟ انہوں نے سوچا رانی کے پاس چل کر بیٹھیں۔ شاید اس طرح دل بہل جائے۔ ایسا سوچتے سوچتے وہ بے خیالی میں رانی کے کمرے کے اندر چلے گئے۔ انہوں نے کسی کے ذریعے رانی کو پہلے سے یہ اطلاع بھی نہیں بھجوائی کہ وہ آرہے ہیں۔

رانی اس وقت اپنی ایک سہیلی کے ساتھ بیٹھی تھی، وہ دونوں آپس میں کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ راجا بھوج نے نہ کچھ سوچا نہ سمجھا، سیدھے رانی کی طرف بڑھے اور بے خیالی میں رانی اور اس کی سہیلی کے بیچ میں جا کھڑے ہوئے۔ رانی کی سہیلی نے راجا کو جو اپنے اتنے قریب دیکھا تو شرم کے مارے دوہری ہوگئی اور لجاتی گھبراتی اک دم وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔

راجا بھوج محل کے آداب کا ہمیشہ خیال رکھتے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا

کہ وہ پہلے سے اطلاع کرائے بغیر، آداب کے خلاف اس طرح اچانک رانی کے پاس چلے آئے۔ رانی کو ان کی یہ بات بہت بُری لگی، وہ اک دم سے بول اُٹھی :۔"بے وقوف کہیں کے!"

رانی نے یہ بات دھیرے سے کہی تھی لیکن راجا بھوج نے سُن لی۔ وہ نہ جانے کس اُدھیڑ بُن میں تھے کہ پھر بھی اُس بات کا مطلب نہ سمجھے۔ایسی ناگوار بات سُن لینے کے بعد وہ رانی کے پاس نہیں رُکے، سیدھے دربار میں آکر اپنے تخت پر بیٹھ گئے۔

دربار میں بیٹھے بیٹھے وہ سوچنے لگے کہ رانی نے اُنہیں ایسا کیوں کہا! اس بارے میں وہ جتنا زیادہ سوچتے جاتے تھے، ان کی اُلجھن اتنی ہی بڑھتی جاتی تھی۔ رانی نے جو بات کہی تھی اُس کا مطلب ان کی سمجھ میں بالکل نہ آیا اور وہ پہلے سے بھی زیادہ بے چین اور پریشان ہو گئے ——— پھر تو ان کی یہ حالت ہو گئی کہ اس بات کے علاوہ ان کے دماغ میں کوئی اور بات ہی نہ رہی۔ دربار میں جو کوئی بھی آتا، راجا اُسے دیکھ کر دھیرے سے کہتے ——— "بے وقوف کہیں کے" لیکن یہ بات اس طرح کہتے کہ جسے کہہ رہے ہیں، وہ بھی سُن لے۔

بہت دیر تک یہی چکّر چلتا رہا۔ لوگ آتے رہے اور راجا اُنہیں "بے وقوف کہیں کے" کہتے رہے۔ درباریوں نے پہلے تو انہیں حیرت سے دیکھا، پھر سب آپس میں کھُسر پھُسر کرنے لگے کہ راجا کو آخر ہو کیا گیا ہے!

کوئی کہتا ——— "راجا کا دماغ چل گیا ہے۔"

کوئی کہتا ——— "راجا کو کچھ سنک چڑھ گئی ہے۔"

کوئی کہتا ——— "راجا پاگل ہو گیا ہے۔"
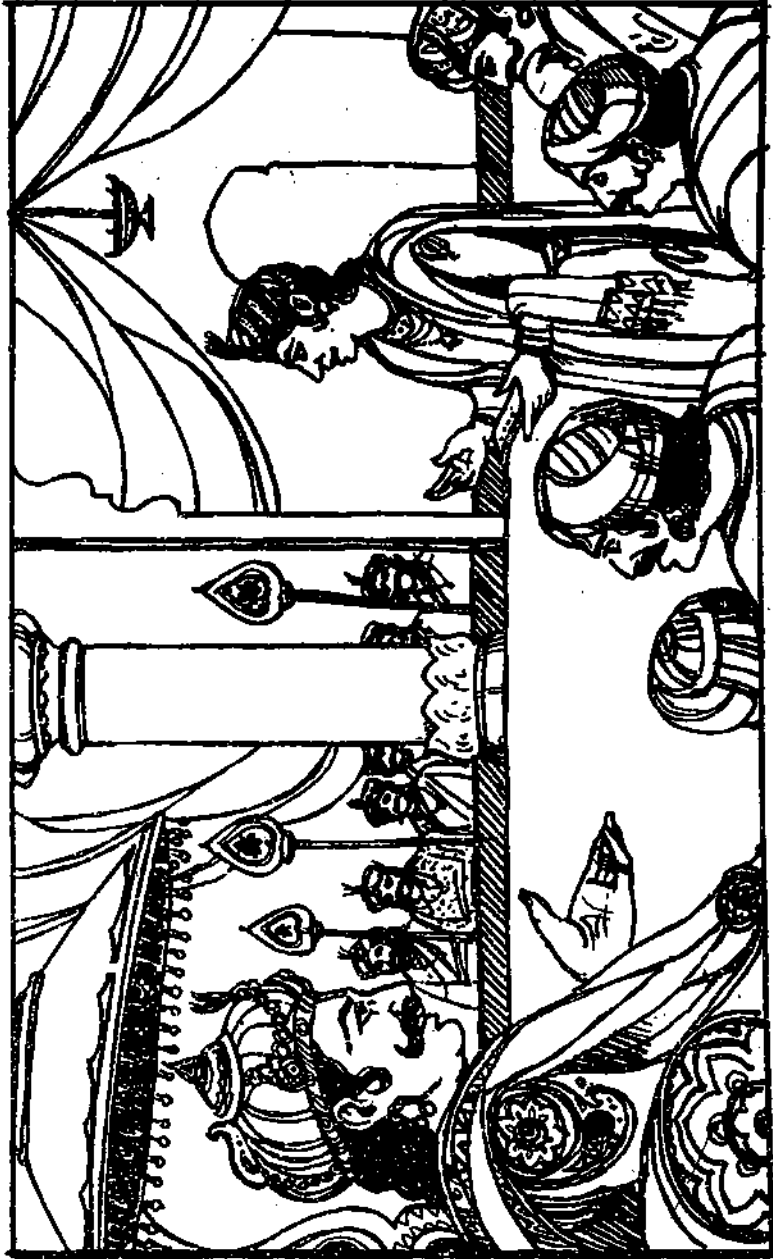
کوئی کہتا ـــــ "اس کے دماغ پر گرمی چڑھ گئی ہے۔"

اس طرح سارے درباری راجا کی دماغی حالت پر شک کرنے لگے۔ ماگھ پنڈت راجا کی ایسی حالت دیکھ کر بہت پریشان اور فکرمند ہو گئے۔ وہ سوچنے لگے، اس بات میں ضرور کوئی بھید ہے ـــــ لیکن راجا ان سب باتوں سے بے پرواہ اپنی دُھن میں بیٹھے ہوئے تھے اور ہر آنے والے کو "بے وقوف کہیں کے" کہتے جا رہے تھے۔

یکایک سامنے سے کالی داس آتے دکھائی دیئے۔ وہ راجا بھوج کے دربار کے سب بڑے شاعر تھے۔ راجا اُن کی بڑی عزت کرتا تھا۔ سب کی نظریں کالی داس کے چہرے پر جم گئیں کہ دیکھیں راجا کالی داس کو بھی "بے وقوف کہیں کے" کہتے ہیں یا نہیں؟

جب کالی داس راجا کے قریب آئے اور اُنہیں سلام کرکے بیٹھنے لگے تو راجا نے دھیرے سے کہا۔ "بے وقوف کہیں کے!"

کالی داس نے راجا کی بات سُن لی، وہ بیٹھتے بیٹھتے رُک گئے۔ انہوں نے پہلے تو راجا کی طرف غور سے دیکھا، راجا بہت سنجیدہ نظر آیا۔ پھر انہوں نے درباریوں پر ایک نظر ڈالی۔ سارے درباری خاموش تھے اور ان ہی کو دیکھ رہے تھے۔ کالی داس بھی سنجیدہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر تک وہ کچھ سوچتے رہے پھر بولے:-

غلطی ہو مجھ سے تو، معاف کرو
راجا جی میرے ساتھ انصاف کرو
رستے کے بیچ میں نے کچھ کھایا نہیں
بے سُر گانا کوئی، گایا نہیں

گزری ہوئی باتوں کی چنتا نہ کی
احسان کرکے جتایا نہ کبھی
دو لوگ کرتے ہوں باتیں جہاں
ان کے بیچ پہنچا نہ بھول کے کبھی
بات میں آپ کی جو بھید ہے گہرا
تو بتلاؤ کیوں کر میں بے وقوف ٹھہرا

اب راجا کی سمجھ میں ساری بات آ گئی کہ رانی نے انہیں "بے وقوف کہیں کے" کیوں کر کہا تھا۔ وہ کالی داس کی اس بات پر بہت خوش ہوئے۔

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

بھوت پریت

صفحات: 16

قیمت : -/9 روپے

اکبرالہ آبادی

مصنفہ : صغرامہدی

صفحات: 60

قیمت : -/10 روپے

انوکھی کہانیاں

مرتبہ : محمد قاسم صدیقی

صفحات: 31

قیمت : -/7 روپے

عرب کی لوک کہانیاں ایک تہذیبی ورثہ

مصنف: حسن عسکری کاظمی

صفحات: 131

قیمت : -/15 روپے

ایلس آئینہ گھر میں (دوسرا حصہ)

مصنف: لیوس کیرل

صفحات: 96

قیمت : -/13 روپے

آدم زاد پری لوک میں

مصنف: ضمیر درویش

صفحات: 110

قیمت : -/10 روپے

₹ 12/-

ISBN:978-81-7587-728-3

राष्ट्रीय उर्दू भाषा विकास परिषद्

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان

National Council for Promotion of Urdu Language

Farogh-e-Urdu Bhawan, FC- 33/9, Institutional Area,
Jasola, New Delhi-110 025